صہبائے کہن

تذکرہ شعرائے مسلم (قدیم)

جوہر دیوبندی
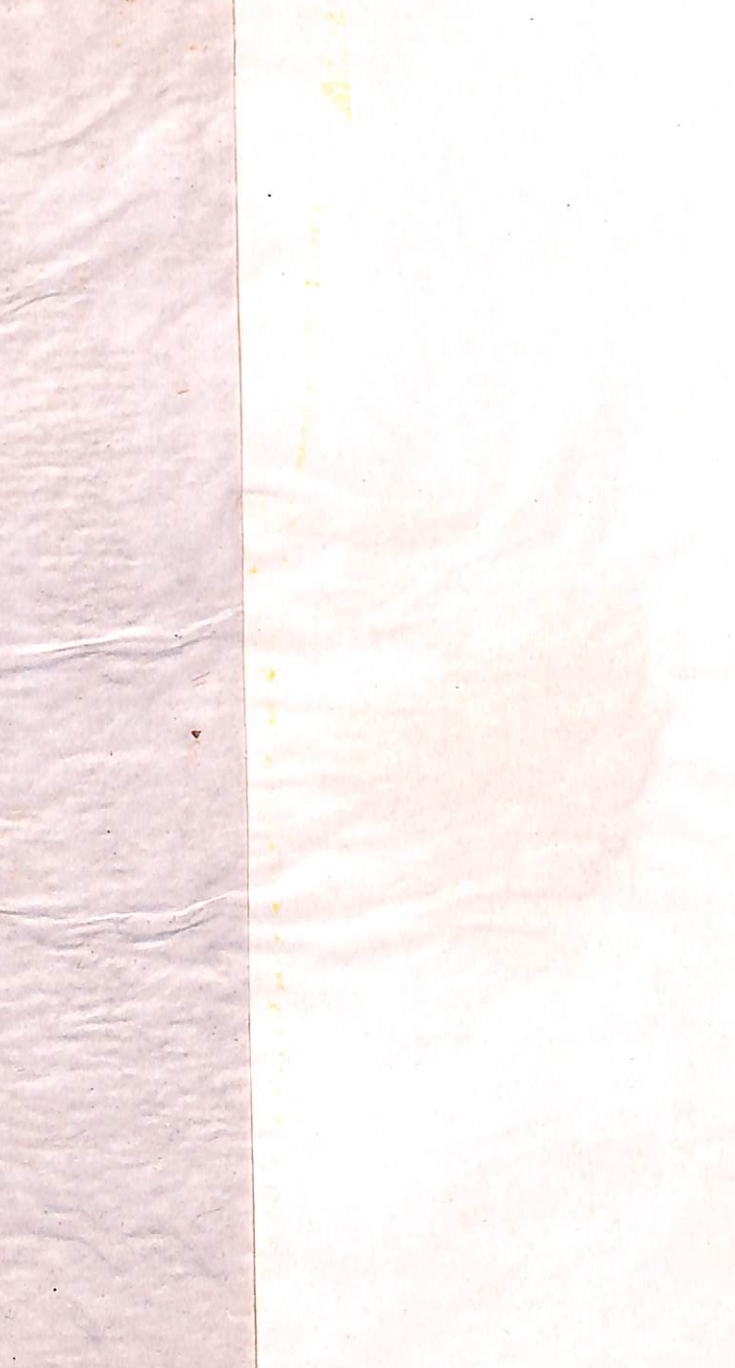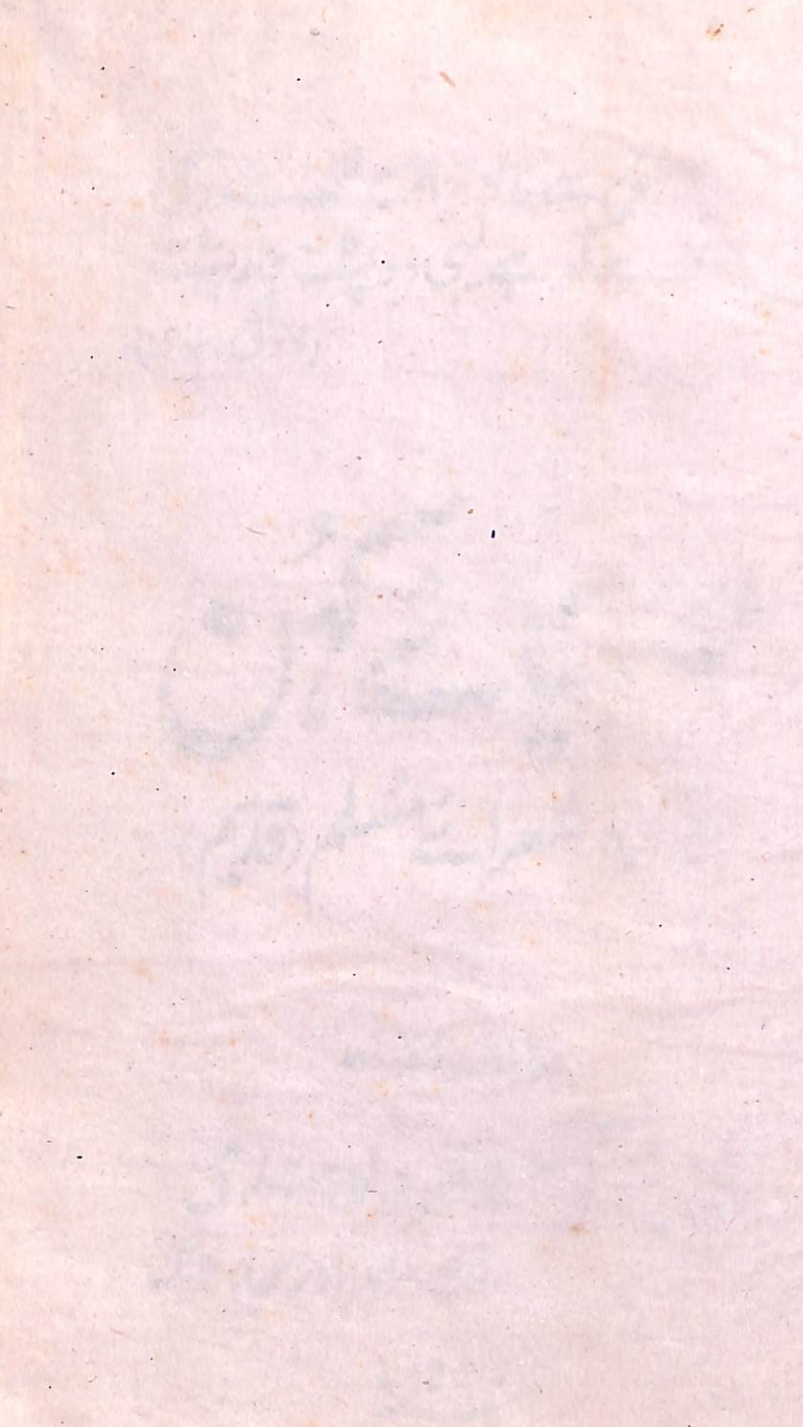
رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت
(ذوقؔ دہلوی)

صہبائے کہن

تذکرہ شعرائے مسلم (قدیم)

مؤلفہ و مصنفہ

بی۔ پی گپتا جوہر دیوبندی
ڈی۔ لٹ (آنرس) علیگ

سنہ ۱۹۹۲ء

قیمت ساٹھ روپیہ

نام کتاب ______ صہبائے کہُن
مصنّف و ناشر ______ بی۔ پی گپتا جوہر دیوبندی
بارِ اوّل ______ پانچسو (۵۰۰)
مطبوعہ ______ طالب پرنٹنگ پریس۔ سہارنپور
کتابت ______ شیخ رضوان احمد۔ ایم۔اے
سنِ اشاعت ______ سنہ ۱۹۹۲ء
قیمت ______ ساٹھ روپئے

کتاب ملنے کے پتے

(۱)۔ جوہر دیوبندی، گپتا نواس، مکھن نگر (ریلوے کالونی) سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یو۔پی)
(۲)۔ سید اختر الاسلام، مدیر "میرٹھ میلہ" 158/ شاہ پیتھن۔ میرٹھ (یو۔پی)

انتساب

مَیں اپنی تحقیقی تصنیف موسُومہ "صہبائے کہُن"
کو بہ خلوصِ دِل مربّیِ علم و ادب جناب ندیم سرور صاحب
گورنمنٹ کنٹریکٹر سہارن پور کے نامِ نامی و اسمِ گرامی
پر معنون کرتا ہوں!

جوہر دیوبندی

تعارفِ مُصنّف

نام ——— بُدھ پرکاش گُپتا
تخلّص ——— جوہر دیوبندی
خلف ——— لالہ کشوری لال
سنِ پیدائش ——— ۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء
متوطن ——— دیوبند ضلع سہارنپور۔ (مقیم سہارنپور)
شاگرد ——— بابو شمبھو دیال بھٹناگر سرشار۔ سہارنپوری

دیگر تصنیفات مُصنّف

(1) ——— جوہرِ سخن (شعری مجموعہ) ——— سنہ ۱۹۶۵ء
(2) ——— نقشِ معتبر " " ——— سنہ ۱۹۷۷ء
(3) ——— موجِ گنگ (تذکرۂ شعرائے ہنود) ——— سنہ ۱۹۸۳ء
(4) ——— نغمۂ ناقوس " " ——— سنہ ۱۹۸۵ء
(5) ——— کلّیاتِ جوہر (شعری مجموعہ) ——— سنہ ۱۹۸۸ء

JOHAR DEOBANDI
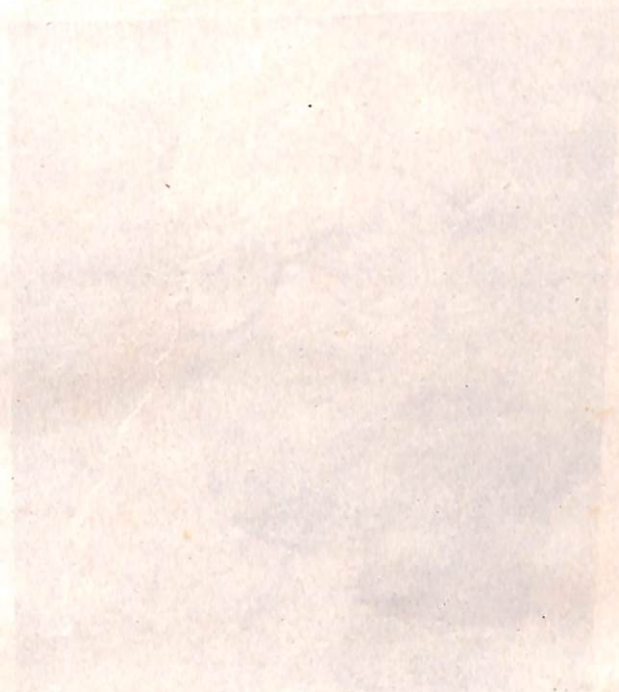
حرفِ آغاز

اردو زبان کی ہمہ گیری اور شہرت کا راز خود اس کی ندرت اور لطافت میں پوشیدہ ہے۔ یہ زبان ہمارے ملک کی ہر دلعزیز زبان ہے جو تاریخی تشکیل کے ساتھ عوام اور خواص کے دلوں پر حکومت کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ اردو زبان کی ترویج اور اشاعت میں بلاتفریق مذہب و ملت اہلِ قلم اور دانشور طبقے نے سرگرمی سے حصّہ لیا ہے اور یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ اردو زبان کے نوک پلک سنوارنے اور درست کرنے میں ہر قوم کے افراد نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اردو زبان کا تاریخی کردار بے شمار واقعات اور حوادث اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

ہمارے ملک میں اردو زبان کی بنیاد اب سے قریب تیرہ سو سال پیشتر عربوں کے حملوں سے پڑی۔ عربوں کے حملوں سے قبل یہاں سنسکرت اور پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں جن میں اوّل الذکر کا تعلق سلطنت اور حکومت سے تھا اور موخر الذکر عوام میں رائج تھی۔

عربوں کے بعد ترکی اور ایرانی ہندوستان میں داخل ہوئے جن کے سبب یہاں کی زبان متاثر ہوئی اور عربی۔ ترکی اور ایرانی زبانوں کے الفاظ بھی یہاں کی زبان میں شامل ہو گئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی زبان کا آغاز ہونے لگا۔ سبکتگین۔ محمود غزنوی اور قطب الدین ایبک کے حملوں سے بھی اِس زبان پر گہرا اثر پڑا اور مقامی اور بیرونی افراد کے تعاون سے اردو زبان کا خاکہ نمایاں ہوا۔

اردو کے معنی لشکر کے بازار کے ہیں جو لوگ حملہ ور کی صورت میں یہاں آئے وہ لشکر کی صورت میں یہاں رہتے تھے لہذا ان کے سودا سلف خریدنے کیلئے جو بازار ہندوستانی دوکاندار لگاتے تھے اسی بازار میں اس زبان کا جنم ہوا اور یہ اردو کے نام سے پکاری جانے لگی۔

حضرت امیر خسرو اردو شاعری کے موجد مانے جاتے ہیں یہ دور علاؤالدین خلجی کا تھا۔ اس کے بعد سکندر لودی کا دور شروع ہوا۔ جس میں پرتگالیوں کے ساتھ ساتھ ڈچ فرانسیسی اور دوسرے یورپ کے افراد بھی یہاں آئے اور ان افراد کی زبانوں کے الفاظ بھی اس زبان میں گھل مل گئے

امیر خسرو کے بعد کبیر داس۔ سور داس اور تلسی داس نے اپنی ہندی شاعری میں کافی تعداد میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے

اکبر بادشاہ نے اس زبان کو عوامی زبان بنانے کے لئے مینا بازار کی بنیاد ڈالی بیگم نور جہاں اور عالمگیر کی بیٹی زیب النساء جو فارسی زبان کی شاعرات تھیں نے بھی اس زبان کو اپنایا اور اس زبان میں شاعری کی۔

شاہ جہاں کے دور میں نئی نئی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ باہر کے ملکوں سے فنکار اور کاریگر یہاں لائے گئے۔ لہذا ان لوگوں کی آمد سے بھی کافی موقعہ اس زبان کو آگے بڑھنے کا ملا۔ امیر خسرو کے بعد ولی دکنی نے اردو شاعری کی ناخدائی کی اور پھر اسے میر تقی میر نے منزلِ مقصود تک پہنچایا۔

مغلیہ تاجدار شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر کو بھی اردو شاعری سے خاص لگاؤ تھا اور ان حضرات نے بھی چار چار دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی اردو زبان کی تالیف اور تصنیف کا کام زوروں پر رہا۔ مختصر یہ کہ اردو زبان کی بقاء اور ترقی میں ہندو اور مسلم دونوں قوموں کا جہاں ہاتھ ہے وہاں انگریزوں نے بھی اس چمن کی آبیاری کی۔

میں اس تصنیف سے قبل اپنی ۲ دو تصنیفات "موجِ گنگ" اور "نغمۂ ناقوس" کے

ذریعہ ہندو شعراء کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ اب یہ زیر نظر مجموعہ "صہبائے کہن" قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ اس مجموعہ میں ایک سو ایک منتخب مسلم شعراء یعنی ولی دکنی سے الطاف حسین حالی پانی پتی تک کا تعارف اور نمونہ کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جس حد تک میں جدّوجہد کر سکتا تھا کی تاکہ یہ ادبی دستاویز اپنی افادیت اور انفرادیت کے لحاظ سے آنیوالی نسلوں کیلئے مشعلِ راہ کا کام دے سکے

اردو ادب میں مسلم شعراء کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا تمام شعراء کا احاطہ کرنا ایک مصنف کیلئے ناممکنات میں سے ہے چونکہ اردو شاعری میں مسلم شعراء کا حصّہ نمایاں طور پر رہا ہے اس لئے میری خواہش ہوئی کہ مخصوص مسلم شعراء کا بھی ایک مختصر تذکرہ دستاویزی صورت میں اہلِ ادب کے سامنے لایا جائے اس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ کرنا تو اہلِ نظر اور اہلِ فن حضرات کا کام ہے۔

"صہبائے کہن" ادبی زندگی کا ایک ایسا سرمایہ ہے جس کو مستقبل کے لئے محفوظ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ "صہبائے کہن" کے آئینہ میں ہم دورِ گذشتہ کے ماحول اور معاشرے سے نیز شعرائے ماضی کے افکار و احوال کا جائزہ لیکر زبانِ حال کے گیسو سنوار سکتے ہیں۔

شعرائے متقدمین کی ادبی خدمات اور ان کی ان تھک ادبی اور علمی کاوشیں ہمارے لئے چراغِ راہ کا کام دے سکتی ہیں اور ہم ان سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

لیجئے "صہبائے کہن" حاضر ہے ان حضرات کی خدمت میں جو اردو ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور اس کے لئے بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آداب

خاکسار
جوہر دیوبندی

گیتا نواس
مکھن نگر ریلوے کالونی
سہارنپور 247001 (یو پی) بھارت

عظیم شاہکار

• از علامہ کرشن لال ادیب لکھنوی (برادرِ خرد جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی)

جناب ڈاکٹر جوہر دیوبندی کی ولادت قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے ایک متمول زمیندار اور تجارت پیشہ اگروال گھرانے میں ۲ اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء کو ہوئی اگرچہ آپ سنہ ۱۹۳۴ء سے مستقل طور پر سہارنپور میں مقیم ہیں لیکن دیوبندی ہی کہے جاتے ہیں۔ جوہر صاحب کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جو نظم اور نثر دونوں ہی کے ذریعہ زبان و ادب کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔

جوہر صاحب ہمہ گیر شہرت کے مالک ہیں اور عرصہ دراز سے لیلائے ادب کے گیسو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ بعنوان "جوہرِ سخن" سنہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرا شعری مجموعہ "نقشِ معتبر" سنہ ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ دونوں مجموعے آپ کے تخلیقی جوہر کے نمونے ہیں اور کیوں نہ ہوں" آپ نے اس فن کو ایک مستند استاد سے حاصل کیا ہے۔ آپکے کلام میں پختگی اور سنجیدگی ہے۔ استادانہ کلام کے دلدادہ ہیں۔ آپ جدت پر فن کو قربان کرنا نہیں چاہتے۔ سنہ ۱۹۸۸ء میں آپکے کلام کا تیسرا مجموعہ "کلیاتِ جوہر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

آپ نے غزلوں کے علاوہ نعت۔ سلام۔ منقبت میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور تضمین۔ مسدس اور قطعات میں بھی فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ نے ایک سچے وطن پرست کی طرح ملک کی تحریکِ آزادی میں بھی حصہ لیا ہے آپ مہاتما گاندھی کے مداحوں میں ہیں۔ آپ کی نظمیں شہیدانِ وطن۔ شہیدِ اعظم

مہاتما گاندھی وغیرہ آپ کے احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ آپ کو آپ کی بے تعصبی اور حب الوطنی کے باعث احترام اور ہر دلعزیزی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ کی مخلصانہ رواداری کا ثبوت آپ کے کلام میں ہر جگہ ملتا ہے ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام آپ کا شعار ہے۔ حمد۔ نعت۔ پیامِ پنجتن رشی دیانند۔ مہابیر سوامی۔ کرشن کنہیا اور دارالعلوم دیوبند جیسی نظموں سے آپ کے احساسات کا پتا چلتا ہے۔ آپ کے احباب میں بھی مختلف مذاہب ماننے والے حضرات ہیں۔

آپ نے تذکرہ نویسی کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے "موجِ گنگ" اور "نغمۂ ناقوس" کے عنوانات سے دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ہندو شعراء پر مشتمل ہیں۔ اِس راہ میں آپ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ اپنے عزم اور ارادے کے ساتھ اس دُشوار گذار راستے کو طے کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ تذکرہ نویسی کے آئینہ میں یہ دونوں ابھری ہوئی تصویریں اپنے جمال و کمال کے ساتھ دعوتِ فکر و نظر دے رہی ہیں۔

اس تذکرہ نویسی کے سلسلہ میں آپ کو ابھی ایک قدم اور آگے بڑھکر ایک معرکہ اور سر کرنا تھا یعنی قدیم مسلم شعراء کے تذکرہ کو کتابی صورت میں پیش کرنا۔ چنانچہ آپ اس منزل کو بھی طے کر چکے ہیں اور یہ ادبی شاہکار "صہبائے کہن" کے عنوان سے اہلِ نظر کے روبرو موجود ہے اس تذکرہ میں وَلی دکنی سے الطاف حسین حالی پانی پتی تک کے دور کے قریب ایک صد مستند مسلم شعراء کا تعارف اور نمونۂ کلام مرتب کر کے اہلِ ادب کی خدمت میں پیش کرنا اس ضعیفی کے عالم میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ آپ کی اعلیٰ ہمتی کی داد دینی پڑتی ہے۔

آپ کی شاعری اسلوبِ بیان۔ فنی چابک دستی اور فکری صلاحیتوں سے

معمور ہے۔ آپ فکرِ رسا کو پیمانۂ "شرابِ کہن" سے بھی خالی نہیں رہنے دیتے اور اصول وضوابط کا خیال رکھتے ہوئے عروسِ سخن کے نوک پلک درست کرتے رہتے ہیں آپ فنّی اور شعری لوازمات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اصنافِ سخن کے ایک ایک گوشہ کی گرفت کرتے نظر آتے ہیں۔

جن ادب نوازوں نے آپ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ میری اس بات کی تائید فرمائیں گے کہ جوہر صاحب نے اس دورِ جدید میں قدیم روش کا دامن نہیں چھوڑا۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ جدّت طرازی سے گریز کرتے ہوں۔ آپ کے کلام میں جدّت کا عنصر بھی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ غزل ہو یا نظم وطنی شاعری ہو یا مذہبی وہ ہر جگہ اپنے منفرد لہجہ اور انداز کے ساتھ فکرِ رسا کے چراغ روشن کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جدّت کے راستے پر سفر کرنے والے شعراء حضرات عموماً بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں اور حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ادب اور فن کیلئے نقصان دہ ہے۔ شعر اگر دل اور دماغ پر اثر نہیں چھوڑتا تو وہ شعر کہے جانے کا مصداق نہیں ہے اسے اگر پہیلی ہی کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ شعر قلب کی وجدانی کیفیتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جذبوں کی شاعری سامع کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء اس جوہر سے خالی دکھائی دیتے ہیں جبکہ قدیم شعراء میں جذبہ کا اظہار تاثیر سے خالی نہیں ہوتا۔ جوہر صاحب کے کلام کی خوبی کا انحصار جذبات کی ترجمانی پر ہے۔ وہ محبّت کے ہمہ گیر جذبہ کو شعر کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں اور سامع کو متاثر کرتے ہیں۔ آپ کے یہاں یہ تاثیر قریب قریب ہر جگہ نظر آئے گی۔ آپ کی شاعری دل کی آواز ہے اور جذبوں کی ترجمان ہے اس لئے زندہ اور پائندہ رہے گی اور مستقبل پر گہرے نقوش چھوڑے گی۔

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے آپ کی تصنیف "موجِ گنگ" پر آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی سند سے سرفراز فرمایا ہے۔ نیز آپ کی دو تصنیفات "موجِ گنگ" اور کلیاتِ جوہر کو اردو اکیڈمی لکھنؤ نے انعامات سے بھی نوازا ہے۔

جوہر صاحب کی عمر اس وقت قریب اسّی سال ہے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک آپ کو صحت اور اطمینان کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے تاکہ آپ زبان وادب وخلقِ خدا کو فیض پہونچاتے رہیں۔

گرشن لال ادیب

نایاب تحفہ

از سید اختر الاسلام مدیر (میرٹھ میلہ) میرٹھ

جب بھی ڈاکٹر بُدھ پرکاش جوہر دیو بندی کا نام لیا جاتا ہے تو از خود ایک کامیاب شاعر۔ ناقد۔ محقق۔ تذکرہ نگار اور ایک کامیاب انسان کا ہیولیٰ سامنے آجاتا ہے۔ ایک اعزاز یافتہ شاعر اور تذکرہ نگار کے طور پر ان کی اہمیت مسلّم ہے بُنیادی طور پر آپ نے اپنے فن کی ابتدا شاعری سے کی تھی۔ اس کے بعد آپ نثر نگاری کے میدان میں آئے۔ یہ شعری اور نثری مساعی اس طرح معرضِ وجود میں آئیں گویا ان ہی کی تکمیل کے لئے قدرت نے ان کا ضمیر تیار کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ملک کے عوام دانشور اور مستند نقادوں نے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

فنکار نازک حسّیات اور لطیف جذبات کا مرکب ہوتا ہے اس کا ذہن دور رس کشادہ۔ نظر وسیع اور عمیق ہوتی ہے جس کے سبب وہ مشاہداتی اظہار کی راہوں کی تلاش میں کروٹیں لیتا رہتا ہے اور جب شدّت سے متاثر ہوتا ہے اس کا موئے قلم انھیں لفظی پیکروں میں منقش کرتا ہے۔ جوہر صاحب کے اندر کا فنکار ایک اُمڈتا ہوا سیلِ رواں ہے جو جدھر راہ ملی بڑھا اور تمام کشتِ ادب کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے مضطرب اور سیماب آسا رہا۔

جوہر دیوبندی کے کشکول میں ۱۹۶۵ء میں قدرت نے "جوہرِ سخن" اور ۱۹۷۶ء میں "نقشِ معتبر" ڈالے۔ یہ مناسب ضخامت کے آپ کے دو شعری دیوان ہیں جنھوں نے آپ کو بطور شاعر متعارف کرایا۔ اس کے بعد دو عظیم الشان تذکرے "موجِ گنگ" (۱۹۸۳ء) اور "نغمۂ ناقوس" (۱۹۸۵ء) منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد احتسابی کا نتیجہ "کلیاتِ جوہر" کی شکل میں ۱۹۸۶ء میں سامنے آیا گیا شاعر گھوم پھر کر

پھر شاعر ہو گیا۔

موجِ گنگ :- جوہر صاحب کا پہلا اور مستند تذکرہ ہے جس میں ابتدائے شاعری تا ۱۹ ویں صدی قریب ۹۰۰ سو ہندو- سکھ اور عیسائی شعراء اور شاعرات کے مختصر حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام شامل ہے یہ تذکرہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے تعاون سے شائع ہوا۔ اور اس پر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی سند تفویض ہوئی۔ تذکرہ میں آپ نے مختلف کتابوں۔ رسالوں۔ اخباروں اور تذکروں کی ورق گردانی کر کے ان سے اہلِ ہنود شعراء کا انتخاب کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ابتدائی صفحات میں آپ نے چند ایسے ضرب المثال اشعار کی نشاندہی کی ہے جو ہر کس و ناکس کے زیرِ لب ہیں مگر یہ اشعار کس کے ہیں یہ بات پردۂ خفا میں تھی۔ یعنی جوہر صاحب نے نہایت عرق ریزی سے ان اشعار کے تخلیق کاروں کو منظرِ عام کیا۔

نغمۂ ناقوس :- جوہر صاحب کا دوسرا اہم تذکرہ ہے جو ان کے ہم عصر حیات اہلِ ہنود شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے۔ رات گئی بات گئی کے مصداق اب یہ تذکرہ بھی خاص اہمیت و افادیت کا حامل اور بیش قیمت ادبی دستاویز ہے۔ اس تذکرہ کی اشاعت فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے ہوئی۔

کلیاتِ جوہر :- آپ کا شعری مجموعہ ہے جو فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں غزلیات۔ تضمینات منظومات اور قطعات جمع ہیں اور یہ آپ کے اوّل تا حال شعری سرمائے کا انتخاب کہے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب پر آپ کو اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ایوارڈ سے نوازا ہے آپ ایک عظیم المرتبت انسان کہے جا سکتے ہیں کیونکہ آپ کا یوم ولادت ۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء ہے سنہ ولادت سے قطع نظر تاریخی طور پر ۲ر اکتوبر آنجہانی

مہاتما گاندھی اور لال بہادر شاستری جیسے محبانِ وطن کا بھی یوم ولادت ہے جوہر صاحب کی عظیم المرتبی کا ایک یہ ثبوت بھی خاص ہے کہ تاجرانہ پس منظر رکھتے ہوئے بھی وہ زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و شاعری کی طرف مائل اور راغب رہے باٹ اور ترازو سے کام لینے والا بھی شاعر ہو سکتا ہے یہ حجاب جوہر صاحب پر غالب رہتا ہے۔

یہ اتفاق رہا کہ بسلسلہ کاروبار ۱۹۳۴ء میں جب آپ سہارن پور میں وارد ہوئے تو یہاں آپ کی ملاقات بابو شمبھو دیال بھٹناگر سرشار سہارنپوری سے کبھی کبھار ہوتی رہتی تھی۔ سرشار صاحب مجاہد جنگ آزادی ہونے کے سبب کئی بار جیل جا چکے تھے۔ جوہر صاحب آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک روز دورانِ ملاقات ان کی شاعری کا راز کھل گیا۔ جوہر صاحب کو ایک ہادی کی تلاش تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوہر صاحب کھل کر شاعری کے میدان میں آ گئے۔ سرشار صاحب کی رہنمائی آپ کو بہت سازگار ثابت ہوئی حتیٰ کہ بطور شاعر آپ اتنے پختہ کار ہو گئے کہ جب ۲۹ جنوری ۱۹۶۵ء کو سرشار صاحب راہی ملک فنا ہوئے تو جوہر صاحب کو ایک بڑے اجتماع میں سرشار صاحب کا جانشین قرار دے دیا گیا۔

جوہر صاحب کا علم مکتبی تو معمولی ہے مگر انھوں نے وقت گزاری کے شغل کے طور پر جو مطالعہ کیا اس سے آپ کا ذہن کشادہ ہو گیا اور تخلیقی بصارت پیدا ہو گئی۔ یہ تخلیقی بصارت کچھ تو اشعار کی صورت میں نمو پذیر ہوئی لقایا جو خیالات لطیف اور نازک بیانی کے احاطہ سے باہر رہے انھیں آپ نے نثر کی صورت میں صفحہ قرطاس پر پھیلا دیا۔

تذکرہ نگاری سے اردو ادب کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے اس سے شاعر کی ژرف نگاہی مشاہداتی شعور اور تخلیقی بصیرت کو روشنی ملتی ہے۔ آپ کا انداز بیان قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہے مگر چونکہ ان کے قلم میں حد درجہ اخلاص تحقیق

اور دیانت داری ہے اس لئے سیدھی سادی بات تحریر میں بھی دل نشینی اور جذب وکشف کی قوّت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ بھی آپ کی تذکرہ نویسی کا جوہر خاص کہا جائے گا۔ کہ آپ نے اختصار کے ساتھ ضروری اور اہم مطلب کو اساس بنایا ہے۔ اس لئے بیان میں غلو اور بے جا طوالت سے قاری اور سامع محفوظ رہتا ہے۔ پھر تذکرہ کی تحریر میں اعتدال کی حد کے ساتھ ہی کلام کے انتخاب میں بھی اعتدال ملتا ہے۔ اس طرح تحقیق اور ریسرچ سے متعلق طلبا کے لئے یہ بہت مفید اور کار آمد ثابت ہوئے۔ ان ہی تذکروں کا فیض ہے کہ نوجوان اسکالرز نے ان تذکروں سے اکتسابِ فیض کر کے اپنی کتابیات کی فہرست میں ان تذکروں کا ذکر کیا۔

علاوہ ازیں جوہر صاحب نے اپنی تذکرہ نویسی میں بہت احتیاط برتی ہے اور حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ کوئی غلط بات اشاعت میں شامل نہ ہو۔ "موجِ گنگ" میں آپ نے شہیدِ وطن پنڈت رام پرشاد بسمل کو بطور شاعر شامل کیا ہے اور اس کتاب کا انتساب بھی ان کے ہی نام کیا ہے جبکہ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ بسمل جوشیلے مجاہدِ حریّت تھے اور جوشیلی وطنی نظمیں گا گا کر پڑھنا ان کی فطرت تھی۔ جب جوہر صاحب سے اس موضوع پر تذکرہ ہوا اور بسمل صاحب کی غزل بعنوان :-

"سر فروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے"۔ کو متنازع بتایا گیا تو جوہر نے بسمل صاحب کی بہن شاشتری دیوی سے ہوئی اپنی خط وکتابت سامنے رکھ دی جس میں کہا گیا ہے کہ بسمل صاحب بذاتِ خود عظیم فطری شاعر تھے۔ اور متنازع غزل انہی کی ہے۔ اس سے جوہر صاحب کی صدق دلی پر وافر روشنی پڑتی ہے۔

جوہر صاحب بفضلِ تعالیٰ اپنی عمر کی اسّی ویں منزل پر ہیں۔ یہ آپکے آرام کے دن ہیں مگر اپنے جسم اور ذہن کو معروفِ کار اور متحرک رکھنے کے لئے

آپ نے تذکرہ نویسی شروع کی تھی اور شائد اس وقت آپ کے وردِ زبان حسب ذیل شعر تھا

لگانا چاہیئے میدانِ تحقیقات میں چکّر
پڑے رہنا نہیں اچھا ہے یاس و حسرت و غم میں

محولہ بالا شعر آج بھی عملاً آپ نے اپنے لئے مختص اور نشانِ راہ بنایا ہوا ہے سہارنپور جیسے بڑے تجارتی شہر کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی کالونی ملکھن نگر میں ایک مکان گیتالوا اس میں آپ کا قیام ہے جس کے ایک کمرہ میں آپ کا راحت کدہ ہے وہی کمرہ آپ کا دار المطالعہ اور رہائش ہے۔ وہیں الماریوں میں آپ کے زیرِ مطالعہ اخبارات۔ کتابیں۔ رسالے اور متفرق ادبیات جمع ہیں۔ اپنے تذکروں میں آپ نے خاصی طویل کتابیات کی فہرستیں اور حوالہ جات کی نشان دہی کی ہے جس سے آپ کی متوازن حق پسند طبیعت اور شگفتہ اور لطیف انسانیت کا تعارف حاصل ہوتا ہے۔

اپنے اسی دار المطالعہ سے اکتسابِ فیض کر کے اس کراماتی انسان نے ایک نیا شگوفہ یہ کھلایا ہے کہ "صہبائے کہن" کے عنوان سے ایک نئے تذکرہ کی داغ بیل ڈال کر اسے مکمل کر لیا ہے جو کتابی صورت میں اہلِ نظر کے سامنے موجود ہے۔ اگر اسے آپ کی خود احتسابی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

جوہر صاحب کا خمیر دیوبند کی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ اس لئے اس زمین کی بو باس آپ میں رنگ لاتی رہی۔ آپ نے دار العلوم دیوبند میں تعلیم تو حاصل نہیں کی مگر اس منبع علم و فضل سے حد درجہ متاثر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء میں صد سالہ اجلاس دار العلوم دیوبند میں وہ بطورِ خاص شریک ہوئے۔ اور اس موقعہ پر آپ نے ایک مرصّع تہنیتی نظم بعنوان سے دار العلوم دیوبند موزوں کر کے پیش کی جو شیشے کے فریم میں اسی وقت سے دار العلوم کے آفس کی دیوار پر آویزاں ہے۔ اور شائد اس نظم سے ہی آپ کے انسانی تشخص، نقطۂ نظر اور فکری ارتقا میں ایک نیا رنگ پیدا ہو سکا۔

جوہر صاحب کے حلقۂ احباب میں مسلم دوست احباب کی کثرت ہے آپ کا "کلیاتِ جوہر" قومی یکجہتی کا مرقع ہے جس میں اسلامی فکر اور نقطۂ نظر کی نمائندگی کے لئے۔ نعت مبارک۔ پیامِ پنجتن پاک اور حضرت امام حسینؑ پر مناقب ہیں۔ اب اسلامی فکر کو مزید توانائی عطا کرنے کے لئے اور خود اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے شائد آخر عمر میں "صہبائے کہن" کے تذکرہ کی ترتیب دی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جوہر دیوبندی تو بڑا اہلِ ہنود رہا اس نے اذان کی طرف توجہ نہیں دی اور صرف ناقوس سے ہی اپنے کان آشنا کئے رہا۔

"صہبائے کہن" :- ایکسٹو ایک مسلم شعراء کا تذکرہ ہے جو شمس الدین ولی دکنی سے شروع ہو کر خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی پر پہنچتی ہے۔

جوہر صاحب نے بڑی عرق ریزی کے بعد جو یہ گوہر پارے "صہبائے کہن" میں جمع کئے ہیں وہ اردو ادب میں ایک ایسا قیمتی سرمایہ اور نایاب تحفہ ہے جس پر ادبی دُنیا ہمیشہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی اور ایک ایسی تحقیقی دستاویز ہے جس سے شائقین علم و ادب کے دماغ و روح مکیّف اور مجلّٰی ہوتے رہیں گے اور یہ نایاب تحفہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرو نجات کے کتب خانوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا۔ •

سیّد اختر الاسلام

چند مشہور شعرا اور ان کے تخلیق کار

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی
(میر سودا)

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
(میر درد)

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
(میر درد)

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے
(مرزا عظیم بیگ عظیم)

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا
(کلب حسین خاں نادر)

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ سایہ بھی جدا رہتا ہے تاریکی میں انساں سے
(ناسخ)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
(میر تقی میر)

لوٹے بت مسجد بنی مسمار بتخانہ ہوا
پہلے اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا
(رند لکھنوی)

غم نہ کھا تجھ سے سوا رزاق کو ہے فکرِ رزق
لاکھ در وا ہونگے گر بند ایک در ہو جائے گا
(رند لکھنوی)

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے
یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اتار دے
(ذوق)

سُن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھے خلقِ خدا غائبانہ کیا
(آتشؔ لکھنوی)

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
(مومنؔ دہلوی)

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صُورت
(امیرؔ مینائی لکھنوی)

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر
(شاہ نصیرؔ)

دُور سے آئے تھے ساقی سُن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم
(انجامؔ)

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
مخمس "جنازہ نامہ" کا ایک مصرع
(شہیدی بریلوی)

قطعہ

از منظور احمد مظلومؔ کشمیری، تلمیذ مُصنّف

ہر فضا مخمور ہے سرشار ہیں اربابِ فن
کیف کی وادی بنی ہے وادیٔ شعر و سخن
سج رہی ہے بزمِ ساقی مست ہیں مظلومؔ سب
پی رہے ہیں پینے والے جامِ صہبائے کہن

فہرست عنوانات شعراء

آبرو

نام نجم الدین لقب شاہ آبرو تخلص آبرو۔ آپ گوالیار میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش کا پتا نہیں ملتا۔ آپ بچپن میں ہی دہلی تشریف لے آئے تھے آپ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور ان ہی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ ۱۱۶۵ھ یعنی ۱۷۵۰ء میں پچاس سال کی عمر سے تجاوز ہو کر وفات کی۔ چونکہ آپ زیادہ تر فارسی زبان میں کلام کہتے تھے اس لئے اردو کے اشعار خال خال ہی ملتے ہیں۔

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی — تاب لا دے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی

قدر دان حسن کے کہتے ہیں اسے دل مردہ — سانورے چھوڑ کے جو چاہ کرے گوروں کی

گانٹھ کاٹی مرے دل کی تری انکھیاں نے — وہ پلک نہیں یہ کترنی ہے مگر چوروں کی

لب شیریں پہ سریجن کے نہیں خطِ سیاہ — ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

آبرو کوں نہیں کم ظرف کی محبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتوروں کی

افسوس کہ مجھ کو وہ یار بھول جاوے / وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

رستم تری آنکھوں کے اگر ہووے مقابل / آنکھوں کو دیکھ تیری تلوار بھول جاوے

عارض کے آئینہ پر تمنا کے سبز خط ہیں / طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے

گیا شیخ و کیا برہمن جب عاشقی پہ آویں / تسبیح کرے فراموش زنار بھول جاوے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں / جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

نینن سیں نین جب ملائے گیا / دل کے اندر مرے سمائے گیا

نگہہ گرم سیں مرے دل میں / خوش نین آگ سی لگائے گیا

تیرے ملنے کی سیں خبر عاشق / یہی کہتا موا کہ ہائے گیا

سہو کر بولنا تھا مجھ سیتی / بوجھ کر بات کو چھپائے گیا

آبرو ہجر بیچ مرتا تھا / مکھ دکھا کر اسے جلائے گیا

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا / دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا

تجھ راہ بیں ہوا ہے اب تو رقیب کتا / بو پائے گر ہماری آ باندھتا ہے ناں کا

خندوں کے طور گویا دیوار قہقہہ ہے / پھر کر پھرے نہ لڑکا جو اس طرف کو جھانکا

عاشق کے دل پہ ڈالی جب نفس بدنے بُر کی / رجواڑے کی گلی کا تب جا غبار پھانکا

سب عاشقوں میں ہم کو مژدہ ہے آبرو کا / ہے قصد اگر تمہارے دل بیچ امتحاں کا

مت قہر سیتی ہاتھ میں لے دل ہمارے کوں / جلتا ہے کیوں پکڑتا ہے ظالم انگارے کوں

ٹک باغ میں شتاب چلو اے بہار حسن / گل چشم ہو رہا ہے تمہارے نظارے کوں

مرتا ہوں ٹک رہی ہے رمق آ درس دکھا / جا کر کہو ہماری طرف سے پیارے کوں

میں آ پڑا ہوں عشق کے ظالم بھنور کے بیچ / تختہ او پر چلاوتے ہیں جی کے آرے کوں

اپنا جمال ٹک آبرو کو دکھاؤ آج / مدت سے آرزو ہے درس کی بچارے کوں

اشعار متفرق

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کر کمر
خون کرنے کو چلے عاشق کو تہمت باندھکر

عزت ہے جوہری کی جو قیمتی ہو جوہر
ہے آبرو ہمن کو جگ میں سخن ہمارا

جہاں اس خو کی گرمی تھی نہ تھی واں آگ کو عزت
مقابل اس کے جو ہوتی تو آتش لکڑیاں کھاتی

اب دین ہوا زمانہ سازی
آفاق تمام دہریا ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

دختِ رز سے کہا میخانے میں شب رندوں نے
آج تو خوب ہی ٹھنکے تری سوکن کو لگے

تخلص آبرو بر جا ہے میرا
ہمیشہ اشکِ غم سے چشم تر ہے

سر سے لگا کے پاؤں تلک دل ہوا ہوں میں
یاں تک فنِ عشق میں کامل ہوا ہوں میں

نہ دیوے لے کے دل وہ جعدِ مشکیں
اگر باور نہ ہو تو مانگ دیکھو

آتش

خواجہ حیدر علی تخلص آتش۔ پیدائش ۱۷۶۷ء آپ کے بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں آپ کے والد خواجہ علی بخش دہلی سے فیض آباد آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ فیض آباد میں ہی پیدا ہوئے۔ ابھی آپ کا بچپن ہی تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی صحبت کچھ نوجوان سپاہیوں سے ہو گئی جس کے سبب آپ نوجوان اور بہادر نظر آنے لگے۔ نواب محمد تقی نے آپ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا اور اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔ یہاں آکر دیکھا کہ شعر و شاعری کا بازار بہت گرم ہے لہٰذا آپ کو شاعری کا شوق چڑھا اور حضرت مصحفی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اصنافِ سخن میں غزل کے علاوہ کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بادشاہ سلامت کے یہاں سے پچاس یا اسّی روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اسی پر قناعت کرتے تھے۔ شاگردوں یا امیروں سے کوئی مدد قبول نہیں کرتے تھے۔ آپ بہت آزادانہ زندگی

بسر کرتے تھے۔ کبوتروں کا بہت شوق تھا۔ جس حجرے میں آپ قیام فرماتے تھے اس میں ایک پلنگ پڑا رہتا تھا اور وہ بھی جھلنگا اور بوریہ کا فرش۔ اگر شاگردوں میں سے کوئی صاحب پلنگ کو بدل دینے کی بات کرتا تھا تو انکار کر دیتے تھے اور فرمادیتے تھے کہ میں اسی میں خوش ہوں۔ دیواروں میں کبوتروں کے خانے تھے۔ جب آپ حجرے میں بیٹھتے تھے تو کبوتر اڑ اڑ کر آپ کی گردن اور سر پر بیٹھ جاتے تھے اور آپ بہت خوش ہوتے تھے۔ کبوتروں کی بیٹ سے تمام بوریہ اور زمین آلودہ رہتے تھے۔ امیرزادے بھی آتے تو اسی بوریہ پر بیٹھ جاتے۔ آپ بھلے چنگے بیٹھے تھے کہ یکایک موت کا جھونکا ایسا آیا کہ آپ کو اپنے ساتھ اڑا کر لے گیا۔ آپ کا سن وفات ۱۸۴۷ء ہے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھو تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراقِ یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گزرے
جو اشک آنکھوں سے آتا ہے سو بےتابانہ آتا ہے

زیارت ہو گئی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اس کی
کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے

تماشاگاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے بتخانہ ہمارا دل نہیں آتش　　مقام آشنا ہے، یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا　　نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا
نکل اے جان تن سے تا وصالِ یار ہو حاصل　　چمن کی سیر ہے انجام بلبل کو رہائی کا
دل اپنا آئینہ ہے صاف عشق پاک رکھتا ہے　　تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھکو پہچانا ہے آتش نے　　بجا ہے اے صنم جو تجھ کو دعویٰ ہے خدائی کا

کہتے ہیں، ذکرِ لیلیٰ و مجنوں جو چھیڑیے　　چپ رہیئے بس نہ گور کے مردے اکھیڑیے
خوشحال ہیں مٹا کے مجھ کو یہ ہفت آسماں　　یوسف کو کھا کے ہو گئے شیر بھیڑیے
ساقی ہے مے ہے یار ہے بزمِ نشاط ہے　　چھیڑیے نہ اب جو ساز تو مطرب کو چھیڑیے
آئی بہار گل نے قبا اپنی چاک کی　　بخیہ جو پیرہن میں ہے اب اس کو اکھیڑیے
آتش قمارِ عشق میں ترے حضور یار　　چالوں کو اپنی بھول گئے ہیں بکھیڑیے

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں　　سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں
نزدیک آ چکی ہے سواری بہار کی　　برگِ خزاں رسیدہ گلستاں سے دور ہوں
فصلِ بہار آئی ہے کپڑوں کو پھاڑیے　　دل کے غبار دست و گریباں سے دور ہوں
ممکن نہیں نجات اسیرانِ عشق کو　　یہ قیدی وہ نہیں جو زنداں سے دور ہوں
گردش سے چشمِ یار کی آتش عجب نہیں　　جو جو عمل کہ گردشِ دوراں سے دور ہوں

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے　　ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا　　زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
ہمیشہ میں لئے گریباں کو چاک چاک کیا　　تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم　　اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتشؔ — برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

اشعار متفرق

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دمِ آخر بھی بالیں پر مری ہمراہ یار آئے — رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اُس بلائے جان سے آتشؔ پر دیکھئے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک دل ہے نازک خوئے دوست

دیکھ سکتے تھے کہاں کافر مسلماں کی نمود — کھود کر بُت ساز آتشؔ سنگ تربت لے گئے

بُت پرستی کو نہ آتشؔ کی سمجھ لا حاصل — شیخ اللہ بھی تو کعبہ کے پتھر میں نہیں

سفر ہے شرط مُسافر نواز بہتیرے — ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

اختر

نام قاضی محمد صادق خان بہادر تخلص اخترؔ ولد قاضی محمد لعل باشندہ ہگلی شاگرد مرزا قتیل۔ آپ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں عہدہ جلیلہ پر ہمیشہ مامور رہے۔ تذکرہ عالمتاب و محامدِ حیدری و دیوان فارسی اور ریختہ و گنج تیزرغ وغیرہ آپ کی بہت سی تالیفات مشہور ہیں۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے اور کیمیا گر مشہور تھے۔ ۱۸۷۰ء کے قریب وفات کی۔

قطعہ

کل شیخ بن کے مجتہدِ عصر سا قیا — دکھلا کے باغِ سبز ثواب و عذاب کا

کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے بہ طنز — معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا — پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں — لیکن نہ کیجئے مجھے موردِ عتاب کا

مے ہو اور کنجِ باغ ہو ساقی ہو ماہ وش — اور کوئی بھی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخِ بے حجاب — یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

کھینچ اس کو اور اپنے ملا کر وہ منہ سے منہ — دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا

منت سے یہ کہیے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجیئے روزِ حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا کلام
قائل نہیں قبلہ کسی شیخ و شاب کا

قلق ہے درد ہے کاہش ہے غم ہے ناتوانی ہے
فراقِ یار ہے یہ یا بلائے ناگہانی ہے
اُدھر قاصد گیا ہے اور اِدھر جاتا ہے جی اپنا
جوابِ نامہ تک کس کو امیدِ زندگانی ہے

جگر ہے مائلِ سوز آنکھ بھی رونے ہی پر غش ہے
الٰہی کیا کروں یہ سخت کارِ آب و آتش ہے
ہم آغوشی میسّر کس کو ہو اے سیمبر تیری
ولے اس فیض پر نازاں ترا ملبوسِ زرکش ہے

عجب ڈھب کی یہ تعمیرِ خراب آباد بستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے بلندی یاں کی پستی ہے
حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعیِ باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

مستی و ہوش کس نے کہیں یک جا دیکھا
ہاں تری آنکھوں میں ہم پاتے ہیں ہشیاری و خواب
نیند بیمار کو ہر گز نہیں آتی ہے مگر
مردمِ چشم ترے رکھتے ہیں بیماری و خواب

لختِ دل پیہم جو آتے ہیں چلے اشکوں کے ساتھ
اشک کا ہر تار اک تسبیحِ مرجاں ہو گیا
لطفِ بے حد سے ترے سب دشمنِ جاں ہو گئے
ابرِ رحمت ہائے میرے حق میں طوفاں ہو گیا

اشعارِ متفرق

کر لیا بند اس نے در کو دیکھتے ہی میری شکل
کھولتا تھا بند میں جس کے قبائے ناز کا
ملے ہے تو سر غرور ہے اس بزم میں مدام
تو نے اٹھایا یار سے پردہ حجاب کا
جگر آتش دل آتش دیدۂ تر شعلۂ آتش
ہوا ہوں سوزِ الفت سے سراسر شعلۂ آتش

تہمت ہے قبا لاکھ ہو پیراہنِ یوسف
ہے جامۂ عصمت سے مزیّن تنِ یوسف

کوچہ میں پریزادوں کے جاتا ہے تو آختر
اس راہ میں ہم سنتے ہیں اکثر خطرِ دل

دیا بوسہ دہن کا اس نے تہمت اس کو کہتے ہیں
یہ تنگی اور یہ بخشش سخاوت اس کو کہتے ہیں

ڈر ہے بیگانے نہ میرے بعد اس کے یار ہوں
ورنہ جی دے بیٹھنا کچھ عشق میں مشکل نہیں

آہ آتش دم جو شمع خانہ زنجیر ہو
اشک کا ہر قطرہ واں پروانۂ زنجیر ہو

عمر جو گزری سو گزری فکرِ باقی کیجئے
ہے یہ آتش یادگارِ کاروانِ سوختہ

بس کہ اس کا جلوہ چھپیں یہ جبیں آنکھوں میں ہے
ہر نگہہ اک مدِ حیرت آفریں آنکھوں میں ہے

کیا تاسف سے تڑپتے ہیں اسیرانِ قفس
کچھ جو اڑتی سی سنی ہے کہ بہار آئی ہے

ہوں نالہ کش ان سرمئی آنکھوں کا جو آختر
دودِ نفسِ سوختہ سینہ میں فغاں ہے

ہاتھ سے دل لے گئے جی سے قرار آنکھوں سے خواب
چشمِ جادو بھی تری کیا صاحبِ تسخیر ہے

دور اب وہ ہے کہ آختر جائیے جس بزم میں
ہے شرابِ دشمنی سے پُر ایاغِ دوستی

آرزو

نام سراج الدین علی خاں عرف خان آرزو اکبر آبادی شاگرد جناب میر عبد الصمد سخن۔ آپ زیادہ تر کلام فارسی میں کہتے تھے۔ اردو زبان میں آپ کا کلام بہت کم ملتا ہے مگر اس وقت کے اردو شعراء آپ کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ ۱۱۶۹ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور دہلی میں مدفون ہوئے۔

اشعار متفرق

کھول کر بندِ قبا کو ملکِ دل غارت کیا
کیا حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپولے پھوڑے

رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں ترے شہیدوں کے

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

اس زلفِ سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے — آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے
دریائے اشک اپنا جب سر بہ اوج مارے — طوفانِ نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے
فغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا — مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لیکے رووے گا
یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا — کیا تم جواں ہو کے بڑے آدمی ہوئے

آزاد

نام محمد حسین تخلص آزاد باشندہ دہلی۔ ولادت ۱۸۳۱ء ولد محمد باقر۔ آپ کے والد دہلی کے شرفا میں ایک نامور شخص تھے۔ اردو اخبار نویسی آپ کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلا اخبار محمد باقر صاحب نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ آزاد صاحب نے دہلی کالج کے اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ہر امتحان میں انشانویسی میں ممتاز رہے۔ کالج ہی سے نظم اور نثر کے ماہر ہو کر نکلے۔ نظم میں استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ آپ کی والدہ چونکہ ایرانی نسل کی تھی اس لئے گھر میں فارسی زبان کا ہی استعمال ہوتا تھا جس کے سبب فارسی زبان میں پختگی آگئی۔ بھاشا اور ہندی کے نکات سے بھی خوب واقف تھے۔ انگریزی ادب سے بھی خوب آشنا تھے۔ آپ لاہور کے ایک کالج میں ملازم بھی رہے۔ نظم میں جدید قسم کی طرز کے موجد ہیں۔ آپ کی دو تصنیفات آبِ حیات اور سخندانِ فارس بہت مشہور ادبی اور تحقیقی کتابیں ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں جنون کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ جس کا سبب شاید دماغی محنت تھی۔ ۱۹۱۰ء میں وفات کی اور لاہور میں ہی مدفون ہوئے۔

شام کی آمد اور رات کی کیفیت

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو — عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانہ کے پیہم قدم ترے — پیمانے محنتوں کے ہیں یہ بیش و کم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے — اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے — اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سُلجھا کے سو رہو

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو — عالم میں شہزادیِ مشکیں نسب ہے تو
ہونا وہ بعدِ شام شفق میں عیاں ترا — اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں — لہرانا پرنیان و حریرِ سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر — فرمانِ نشان میں یہ اڑے گا جہان پر
تا صبح ہووے گا کارگہہٗ روزگار بند
آرام، حکم عام ہو اور کار و بار بند

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی — ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دُنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم — کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں — اور آسماں پہ کھیلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رُخ ترا دیتا بہار ہے — شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے
سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے — اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں کرتی ہے یہ کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پر اور شاہ تخت پر — ماہی یہ زیرِ آب ہے طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے — دامانِ دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چونکا ہے بلکہ راہزنِ نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے — عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے یا کہ پیٹ میں — سب آگئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں
جس کو پکارو وہ سوئے خوابِ عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید کہ تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے رکھ کر کرن کا تاج نکلتا ہے شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

آزردہ

نام مخدوم اعظم جناب مولوی محمد صدر الدین خان بہادر تخلص آزردہ دہلوی متوطن کشمیر صدر الصدور دہلی۔ خلف مولوی لطف اللہ۔ آپ بڑے عالم و فاضل اور نامی گرامی شخص تھے۔ زیادہ تر فارسی کلام کہتے تھے ۱۲۸۵ھ میں واصل حق ہوئے۔

جمع طوفان و چشم تر مصرف اب مصارف کا کچھ حساب نہیں
کاش مقبول ہو دعائے عدو کیا کروں وہ بھی مستجاب نہیں
اب تو اس چشم تر کا چرچا ہے ذکر دریا نہیں سحاب نہیں
مختصر حال چشم و دل یہ ہے اس کو آرام اس کو خواب نہیں
عشق بازی کا منہ چڑانا ہے اب وہ موسم نہیں شباب نہیں
تیری آنکھوں کے دور میں کیا کیا سحر رسوا نہیں خراب نہیں
جوں سراپائے یار آزردہ تیرے دیوان کا انتخاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے طور کہ اپنے کئے سے پشیماں نہیں
اے بلبلانِ شعلہ دم اک نالہ اور بھی گم کردہ راہِ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
آنکھوں سے دیکھ کر تجھے ماننا پڑا — کہتے ہیں جو ہمیشہ جبیں ہے، چناں نہیں
ملنا یہ تیرا غیر سے ہو بہرِ مصلحت — ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں

گھر سے گھبرا کے کھلے بالوں ہر اک کھٹکے پر — کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں
پہلے آثارِ حیا بھی نہ گئے تھے اتنے — جیسے آنکھوں میں تری اثرِ خواب نہیں
ہزار شیوہ ہیں پنہاں کہ جی ہی جانے ہے — تری آنکھ کا تغافل ہے اک، جواب نہیں

عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے — نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے
دل نے ملا دی خاک میں سب وضعداریاں — جوں جوں رُکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے
باہم ملاپ تھا یہ ترے دورِ حسن میں — یہ رسم اُٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے

ترے مجروح کے سینہ میں کچھ گرمی سی باقی تھی — وہیں بس ہو گیا ٹھنڈا جو کھینچا تیرے پیکاں کو
الجھنے کو بلا ہیں آپ بھی کچھ خیر سے صاحب — لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلفِ پریشاں کو

اشعارِ متفرق

حشر میں آج تجھے دیکھ کے پچھتاتے ہیں — سادہ لوحی سے جو یوسف کے خریدار ہوئے
مر کر بھی ہمارا دلِ بیتاب نہ ٹھہرا — کشتہ بھی ہوا تو یہ سیماب نہ ٹھہرا
پرزے پرزے نہ کرو نامہ مرا بن دیکھے — یہ بھی چھاتی سے لپٹتا ہے کہ منظور نہیں

اسیر

نام سید مظفر علی (خان بہادر) تخلص اسیر۔ آپ کی جائے پیدائش قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ ہے۔ آپ سید مدد علی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کے سب بزرگ عالم و فاضل تھے

اور سرکار شاہی میں اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ بارہ سال کی عمر میں آپ اپنے نانہال مقام لکھنؤ آگئے تھے۔ اور یہاں پر تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ فن شاعری میں حضرت مصحفی کے شاگرد تھے اور واجد علی شاہ کے مصاحب تھے۔ آپنے شاعری میں خوب زور طبع دکھایا اور ناسخ کی زمینوں میں کافی کلام کہا اور نام پیدا کیا غدر کے بعد آپ نے سرکار رام پور میں معززانہ زندگی بسر کی اور آخر ۱۲۹۹ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ آپ بڑے کثیر گو شاعر تھے۔ ایک دیوان بہ زبان فارسی اور تین دیوان بزبان اردو آپ سے یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ درجنوں کتابیں عربی۔ فارسی اور اردو زبان میں لکھی ہیں۔

منقبت

قولِ حدیث پیمبر سے کم نہیں
فرمانِ بادشاہ ہے شقہ وزیر کا

کیوں کر نہ ہو بلند سلیماں سے مرتبہ
دوشِ نبی ہے پایہ علی کے سریر کا

کہتے ہیں اس کو فیض کہ فاقے کئے مگر
پورا کیا سوال یتیم و اسیر کا

نامِ علی ہو وردِ زباں وقتِ نزع بھی
ہو خاتمہ بخیر الٰہی اسیر کا

ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا
شگافِ خامۂ کن چاک ہے میرے گریباں کا

وہ روشن دل ہیں دیوانے نہ نکلا ایک ماخذ سے
سپیدہ صبح جنت کا غبار اپنے بیاباں کا

وہ بلبل ہوں کہ میری گھات میں ایسی زمیں پکڑی
کہ پشتہ بن گیا صیاد دیوارِ گلستاں کا

جو خونریزی یہی ہے تو یقیں ہے چار ہی دن میں
مصلّٰی چلکے کعبہ میں بچھے قاتل کے داماں کا

عجب فیضِ نظر ہے ناز سے جب وہ پری دیکھے
کھٹولا آسماں پر تخت بن جائے سلیماں کا

فرشتے بھی مگر دیوانہ سمجھے مجھ کو محشر میں
دیا سب کو خطِ عصیاں مجھے پرزہ گریباں کا

ہوا ہے میکدہ مقتل اسیر اس کی جدائی میں
نہ ہو کیونکر تیقّن جامِ مے پر زخمِ خنداں کا

فقط نہیں وہ دہن سے شیریں زباں ہے شیریں سخن ہے شیریں
تمام اس کا بدن ہے شیریں خمیر ہے قند و انگبین کا

عجب ہے رسم جہانِ پُرفن کہ دوست ہوتے ہیں جی کے دشمن
چھپایئے جس کو زیرِ دامن وہ سانپ بنتا ہے آستیں کا

منجموں کا نہ رکھ بھروسا کہ علم رکھتا ہے حق تعالیٰ
نہیں ہے روشن کسی پہ اصلا کہ کیا ہے مطلب خطِ جبیں کا

بتانِ خوش چشم نے بصد فن کیا ہے کشتہ دکھا کے جوبن
مری لحد پر ہو بعدِ مردن اسیر گنبد غزالِ چیں کا

موت مشاطہ کو آئی تو ملا بوسۂ زلف — نہ رہا بیچ میں دلاّل تو سودا ٹھہرا
خوف سے بھاگتے پھرتے ہیں پری دیو آتیر — ابنِ آدم میں نہ ٹھہرا کوئی حوّا ٹھہرا

قد ہے اگر خمیدہ تو لازم ہے تارِ اشک — لازم ہے اس کمان پہ چلاّ چڑھاؤں میں
اللہ مجھ کو طائرِ رنگِ حنا کرے — ماتم سرا میں ہاتھ کسی کے نہ آؤں میں

چاندنی میں کون آیا پاؤں میں مل کر حنا — جا بجا ہیں سرخ بوٹے چادرِ مہتاب میں
الفتِ دندانِ جاناں میں کٹی جاتی ہے عمر — ہے رواں کشتی ہماری موتیوں کے آب میں

بسکہ آنکھوں میں روشنائی ہے — خارِ مژگاں دیا سلائی ہے
چین سے سوئے شاہدِ مضموں — جو رباعی ہے چارپائی ہے

اشعارِ متفرق

نشاں کیا پوچھتے ہو تم ہمارے جسمِ لاغر کا — کہ رفتہ رفتہ سایہ بن گیا قدِّ پیمبر کا

کم سشر رسے نہ تھی میری ہستی | آنکھ کھلتے ہی میں تمام ہوا

بام پر چڑھتے اُترتے ہو بہت کیا باعث | سچ بتاؤ ہے کلیجا تہہ و بالا اپنا

عالم کو معجزِ یدِ بیضا دکھاؤں میں | لا بھر دے ساقیا چلو میں میرے آفتاب

کہنے کو یوں جہاں میں ہیں ہزار دوست | مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

مست ایسا کر دیا مجھ کو شرابِ شوق نے | محتسب سے پوچھتا ہوں میں رہِ میخانہ آج

ترقی کچھ جوانی میں نہیں ہے بے قراری کی | ہلا کرتا تھا گہوارا ہمارا خود لڑکپن میں

نہ سہی گر تمہیں منظور ملاقات نہیں | کعبۂ گھر آپ کا اے قبلۂ حاجات نہیں

پئیں گے ہم ملا کر بادۂ انگور تاڑی میں | اسے تاکا ہے ہم نے ساقیا اور اس کو تاڑا ہے

کہتا نہیں کہ یاں رقیبوں کو تو نہ دے | اتنا لحاظ کر کہ مرے روبرو نہ دے

شاعر سے کچھ خطا ہو تو طعنہ فضول ہے | قولِ امام ہے نہ حدیثِ رسول ہے

معترض ہو کوئی نا سمجھ تو لازم ہے سکوت | بے خبر ہے وہ اسیر اس کو خبردار نہ کر

بے مزہ مجھ کو بڑھاپے میں نہ سمجھیں یہ جواں | کہ ابھی نیشکرِ خشک میں رس باقی ہے

لگا رہا ہے جو شرطیں نماز میں واعظ | خدا کا گھر نہ ہوا قمار خانہ ہوا

افسوس

نام میر شیر علی تخلص افسوس۔ خلف میر مظفر خاں داروغہ توپ خانہ نواب قاسم جان۔ باشندہ نارنول۔ شاگرد جناب میر حیدر علی حیراں و میر سوز۔ ملازم مرزا جواں بخت بہادر۔ آخری ایام میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی منشی گری میں مقرر ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

یہاں تک ہے نزاکت گلوں کی کیچڑی سے | لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہونچا

قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس | حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہونچا

اشکِ گرم اپنے سے یہ دیدۂ تر جلتے ہیں | دیکھو مردمِ آبی کے بھی گھر جلتے ہیں

ہو امرا کیونکہ گزر اسکی گلی میں واں تو | طائرِ سدرہ کے اڑتے ہوئے پر جلتے ہیں

اشعار متفرق

نزع میں زرد تھا رخ افسوس
چنپئی رنگ نے اسے مارا

پاؤں یہ گاڑے کہ جوں نقش قدم پھر نہ اٹھے
خاک میں مل گئے بیٹھے جو ترے در پر ہم

کیا لکھوں اس کو میں احوال یہ کہنا قاصد
بس ہوا سی کے سبب طاقت تحریر نہیں

دیکھتے ہی اسے حاضر ہوئے مر جانے کو
وہی احباب جو یاں آئے تھے سمجھانے کو

کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف
مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

پوچھے ہے کیا لگالے اگر سر میں درد ہے
اس خاک پا کے آگے تو صندل بھی گرد ہے

نہیں جائینگے اس مجلس سے ہم بے اس کے لیجائے
قدم اب کب اُٹھاتے ہیں کہ ہم نے پاؤں پھیلائے

آدمی کیا ہے فرشتہ لوٹ جائے دیکھ کر
چاندسی ہے شکل اس کی چھاتی گدرائی ہوئی

امانت

نام سید آغا حسن تخلص امانت باشندہ لکھنؤ خلف میر آغا رضوی۔ شاگرد جناب چھنو لال دلگیر مرثیہ گو۔ ۱۲۷۵ھ میں انتقال کیا۔ آپ کی نظم "واسوخت" بہت مشہور ہے۔

کوچۂ قاتل تلک اے دل رسائی کیجئے
کاسۂ سر ہاتھ میں لیکر گدائی کیجئے

دیر میں برسوں رہے لیکن نہ ہاتھ آیا صنم
کچھ دنوں کعبہ میں چلکر جبہہ سائی کیجئے

ابروئے خمدار کافی ہے ہمارے قتل کو
تیغ سے اغیار پر تیغ آزمائی کیجئے

ٹھوکریں کھاتے ہیں شوق منزل مقصود میں
جلد اے خضر غریباں رہنمائی کیجئے

بعد مدت آئینہ بھیجا مجھے دلدار نے
ہے یہ اب مطلب کہ در پردہ صفائی کیجئے

منفعل شمشاد کو کیجے نہ ٹیڑھی چال سے
راست بازوں سے نہ ایسی کج ادائی کیجئے

نزع میں منھ سے امانت کے یہ نکلے یا خدا
جلد اے مشکل کشا مشکل کشائی کیجئے

ہر پل جو لگی ہجر میں اشکوں کی جھڑی ہے
کس کے دُر دنداں سے مری آنکھ لڑی ہے

بے وصل حسیں چین نہیں ایک گھڑی ہے
آفت میں ہے دل جان مصیبت میں پڑی ہے

ہل چل مرے اشکوں کی زمانے میں پڑی ہے
چھالے ہیں نہ بھادوں کی نہ ساون کی جھڑی ہے

دل حشر بپا کرتا ہے سر پر مرے کیا کیا
جو ہجر کی ساعت ہے قیامت کی گھڑی ہے

خون اس کے جہاں سے جو عارض پہ ہے نکلا
یاقوت کی چُنّی مہتہ کامل یہ پڑی ہے

رکھنا قدم اے دل رہِ وحشت میں سمجھ کر
زنجیر کا ہے سامنا منزل یہ کڑی ہے

ایذا ہوئی گیسو کی محبت میں امانت
اس سانپ کو جب میں نے چھوا مار پڑی ہے

دل بلبلوں کے اس نے گلستاں میں رکھ لئے
دو چار پھول توڑ کے داماں میں رکھ لئے

جوشِ جنوں نے مجھ کو ستایا جو ضعف میں
مشکل سے ہاتھ اٹھا کے گریباں میں رکھ لئے

آ آ کے غیر کرتے ہیں اپنی خوشامدیں
نوکر ہزاروں کوچۂ جاناں میں رکھ لئے

اگلی بہار کے لئے اے پنجۂ جنوں
دو چار تار ہم نے گریباں میں رکھ لئے

کچھ کچھ ہمارے پاؤں کو چین آیا دشت میں
تلوے جب اپنے خارِ مغیلاں میں رکھ لئے

پایا نہ آب و دانہ کیا شکرِ کردگار
روزے ہزاروں ہم نے بیاباں میں رکھ لئے

تھی خواہشِ وصال امانت کو کس قدر
خنجر پلنگ پر شبِ ہجراں میں رکھ لئے

وصل کا روز گزر کر شبِ فرقت آئی
رات کیا آئی کہ مجھ پہ قیامت آئی

دن گیا وصل کا اندھیر ہوا ہائے غضب
کالا منہ لیکے پھر اپنا شبِ فرقت آئی

حشر برپا کیا میخانہ میں اس میکش نے
نشہ کیا آنکھوں میں آیا کہ قیامت آئی

اشک بہنے کا ہوا حال یہ ہم پر روشن
سوزِ پروانہ پہ ہے شمع کو رقت آئی

لکھ دیا شربتِ دیدارِ صنم عاشق کو
اے طبیبو یہ کہاں سے تمہیں حکمت آئی

جلد دیدار دکھا دے مجھے اے پردہ نشیں
گر کیا حشر کا وعدہ تو قیامت آئی

جل گئے آتشِ رخسار سے تیور اپنے
دیکھا سبزے کو تو آنکھوں میں طراوت آئی

نظرِ بد جو ہوئی دکھنے لگی اس کی آنکھ
دیکھنے میں تو نہیں ایسی نزاکت آئی

زندگی سے جو امانت تو خفا رہتا ہے
سچ بتا دے تری کس پر ہے طبیعت آئی

واسوخت کے چند بند

کیا وہ دن تھے کہ محبت سے سروکار نہ تھا دام کاکل میں حسینوں کے گرفتار نہ
کسی معشوق کا میں طالبِ دیدار نہ تھا دل کسی نرگسِ بیمار کا بیمار نہ
راحتِ وصل نہ ایذائے غمِ فرقت تھی
رات دن عیش تھا اور دوستوں سے صحبت تھی

عشق کے نام سے آگے نہ خبر تھی واللہ حال یوں دل کا نہ تھا حسن پرستی سے
جھینپتی آنکھ حسینوں سے سدا تھی واللہ دیکھتا تھا کسی معشوق کو بھر کر نہ نگا
کوئی کہتا تھا جو عاشق تو میں چھپ جاتا تھا
اچھی صورت پہ کبھی دل نہ تڑپ جاتا تھا

نظر آتی تھی کسی کی جو مجھے زلفِ سیاہ جان کر مارِ سیہ مانگتا تھا اس سے پنا
گر کسی ابروئے خمدار پہ پڑتی تھی نگاہ سر جھکا لیتا تھا تلوار سمجھ کر میں آ
کسی قاتل کی مژہ جب کہ نظر آتی تھی
شکل خنجر کی مری آنکھ میں پھر جاتی تھی

گر کسی نرگسِ مخمور پہ پڑتی تھی نظر دور میں بھاگتا تھا جان کے مے کا ساغ
دیدبازی کبھی کرتا کوئی خوش چشم اگر کین دکھلاتا تھا میں اس کو وہیں جھنجلا کر
شوخیِ چشم سے آگاہ دلِ زار نہ تھا
عشق کا تیر کلیجے کے مرے پار نہ تھا

باغِ عالم کے گلوں سے مجھے ہوتا تھا خار خوش نہ آتی تھی کبھی پھول سے عارض کی بہار
تنگ ہوتا مرا دل غنچہ لبوں سے ہر بار مسکرانے پہ حسینوں کے نہ روتا زنہار
چمنِ دہر میں رہتا تھا کھلا گل کی طرح
نالہ کرتا تھا شب و روز نہ بلبل کی طرح

امیر

نام منشی امیر احمد مینائی تخلص امیر خلف مولوی کرم احمد مینائی باشندہ لکھنؤ آپ کا سلسلہ مخدوم شاہ مینا لکھنوی سے ملتا ہے۔ آپ ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ اور دوسرے علماء سے پڑھ کر شعر و شاعری کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور مظفر علی اسیر سے تلمذ اختیار کیا۔ ۱۲۶۹ھ میں دربار شاہی تک رسائی کی۔ ۱۲۷۵ھ میں رام پور آگئے اور نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ نواب صاحب نے آپ کی بڑی قدر کی۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد آپ بھی داغ کی طرح قسمت آزمائی کے لئے حیدر آباد دکن پہونچ گئے۔ وہاں پہونچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۹۰۰ء میں سفر آخرت کیا۔ آپ کو ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل تھی آپ کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں۔

نمودِ خط ابھی اے حسنِ یار باقی ہے ۔۔۔ اِس آئینہ کے جگر میں غبار باقی ہے
وہ صید گاہ سے جاتے ہیں اے اجل کہدے ۔۔۔ ادھر بھی بے پر و بال اک شکار باقی ہے
وہ منتظر ہیں کہ مرلوں تو لاش پر آئیں ۔۔۔ اجل کو آنے میں کیا انتظار باقی ہے
نہ جائیگی کبھی تا زیست اپنی سوزشِ دل ۔۔۔ کہ شیر زندہ ہے جبتک بخار باقی ہے
چلے برنگِ نقش عمر بھر تو کیا حاصل ۔۔۔ کہ منزلوں ہی ابھی کوئے یار باقی ہے
وہ ذبح کرکے لہو پر چھڑک رہے ہیں جو خاک ۔۔۔ اشارہ ہے کہ ابھی تک غبار باقی ہے
موئے تو خاک موئے ہم مٹے تو خاک مٹے ۔۔۔ ابھی تلک تو نشانِ مزار باقی ہے
قضا پکارتی پھرتی ہے ان کی مقتل میں ۔۔۔ چلے اگر کوئی امیدوار باقی ہے
کلیم بیٹھ رہے طور پر خیال نہیں ۔۔۔ کہ اور بھی کوئی امیدوار باقی ہے
مثالِ آئینہ وا ہیں مزار میں آنکھیں ۔۔۔ ہنوز حسرتِ دیدارِ یار باقی ہے
شریک سینکڑوں گل رو ہیں اپنے پھولوں میں ۔۔۔ خزاں کے بعد بھی جوشِ بہار باقی ہے
نفس کی آمد و شد ہر نفس یہ کہتی ہے ۔۔۔ کوئی دم اور تجھے اختیار باقی ہے

نکل چلے ہیں بہت طفلِ اشک روک اے دل
ابھی تو جبر پہ کچھ اختیار باقی ہے
امیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے
مزار ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

جہاں میں ہم کوئی دم صورت حباب رہے
خودی کی شرم سے اس پر بھی آپ آپ رہے
نہ مجھ کو آئے نہ ان کو حساب بوسوں کا
یہ لین دین الٰہی علے الحساب رہے
نصیب ہو کہ نہ ہو صبح دیکھنا قاتل
خیال موت کا لازم ہے وقتِ خواب رہے
وصال میں بھی نہ دیکھا برا ہو غفلت کا
ہمیں کو ہوش نہ آیا وہ بے نقاب رہے
نہ ذر سے کام نہ اسباب سے نہ دولت سے
یہ سب رہیں نہ رہیں عالمِ شباب رہے
امیر کیجیئے توبہ کی فکر پیری میں
مزے شراب کے تا عالمِ شباب رہے

پردہ چمک ہے اس کے رُخِ بے حجاب کی
حاجت ہے کیا نقاب پر اس کو نقاب کی
مصروفِ یادِ دوست ہوں اے منکر و نکیر
پوچھا کرو یہاں نہیں فرصت جواب کی
موسیٰ کو یہ خبر ہی تھی کہ برقِ جمال تھی
اک تہہ اُتر گئی تھی تمہارے نقاب کی
اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گیا راہِ شوق میں
میرے غبار نے مری مٹی خراب کی
تا سب پہ شانِ عفو نمایاں ہو روزِ حشر
چن لی ہے اس لئے فرد ہمارے حساب کی

بیگانہ ہو کے بارے جہاں سے جدا ہوا
اے عالم آشنا جو تیرا آشنا ہوا
زائل ہوئی نہ بھیس بدلنے سے بوئے عشق
تصویر میں بھی رنگ ہے رُخ کا اڑا ہوا
یہ ضعف سے سبک ہوں کہ نقش قدم مرا
پڑتا تو ہے زمین پہ لیکن مٹا ہوا
آنکھوں پہ پھر ہے جلوۂ معشوق سامنے
ہے مدتوں سے بیچ کا پردہ پڑا ہوا

اشعار متفرق

جا بجا سبزہ نہیں اے دل یہ قصرِ یار پر
بال کھولے پریاں پھرتی ہیں سر دیوار پر

واعظِ شہر بھی رکھتا ہے کنہیا کا مکٹ
واہ عمامہ عجب جلوہ نما ہے

شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے
ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے تلاشِ حور میں

شیخ کہتا ہے برہمن کو برہمن اس کو سخت
کعبہ و بتخانے میں پتھر ہے پتھر کا جواب

شاعر ہیں اس زمانہ کے دریوزہ گر امیر
نکلے ہیں بھیک مانگنے دیوان بغل میں ہے

سو شعر اک زمین میں کہتے تھے ہم امیر
جب تک نہ شعر کہنے کا ہم کو شعور تھا

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

کام آتی ہے جوانوں کے بہت تدبیرِ پیر
طاقتِ رفتار ہے زورِ کماں سے تیر کو

انجام

نام عمدۃ الملک نواب امیر خاں، تخلص انجام۔ آپ محمد شاہ کے دور میں الہ آباد کے صوبہ دار تھے۔ فارسی اور عربی کے علاوہ آپ کو سنسکرت زبان پر بھی عبور حاصل تھا اپنے وقت کے استاد شاعر مانے جاتے تھے۔ محمد شاہ کے ہاتھ سے انجام کا انجام اچھا نہ ہوا کسی جرم کی پاداش میں ۱۱۵۹ھ میں آپ کو دیوان شاہی میں قتل کر دیا گیا۔ آپ کا گھر بھی ضبط کر لیا گیا۔ اور تمام نادر کتب خانہ برباد ہو گیا۔ یہاں تک کہ تمام کلام بھی تلف ہو گیا۔

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر او بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے رنج و غم کھانے کو ہم

کیوں بلایا پھر میں مجھ سے یہ نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیِ دل پہ طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

سنا کھا اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

نقش میرے دیکھ کر مقبل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

آنسخ

نام مولوی عصمت اللہ تخلص آنسخ ولد چودھری رحمت اللہ باشندہ قصبہ پنڈوا متعلق ہگلی بنگال ۔ ولادت ۱۲۵۳ھ ۔ آپ کلکتہ میں رہتے تھے اور شعر و سخن میں کافی ذوق رکھتے تھے ۔ آپ اپنے کلام پر فرزند احمد صفیر بلگرامی سے مشورہ کرتے تھے ۔

دیکھے نہ کام زینتِ دنیا سے صاف دل
محتاجِ سرمہ ہووے نہ دیدہ حباب کا

کس بادہ نوش کو ہے صبوحی کی احتیاج
دستِ سحر میں ہے جو قدحِ آفتاب کا

پیدا نہیں ہے اس رُخِ پُرنور پر عرق
دیکھو کھینچا ہے عطرِ گلِ آفتاب کا

روئے صافی کی صفائی کا بیاں کیا کیجئے
آئینہ رو ہے مرا حالِ دلِ زار آئینہ

چاند تلوا ایڑیاں انگارے ہیں پاپوش کبک
خط ہے طوطی لب ہے شکر صاف رخسار آئینہ

ہے دلِ صافی کو ہر دم روئے صافی کا خیال
آئینہ کے روبرو رکھا ہے اے یار آئینہ

دیکھ پائے گر ترا روئے منور آفتاب
زرد ہوئے شپہرِ نیلگوں پر آفتاب

ہے تلاش ان روزوں کس نورِ مجسم کی اُسے
صورتِ مشاط پھرتا ہے جو گھر گھر آفتاب

آزاد باغِ دہر میں سر سبز ہیں مدام
کس دن ہے سرو لبِ جوئبار سبز

فیضِ بہارِ عام ہے اے دل عجب نہیں
دریا میں مچھلیوں کے بھی ہو جائیں خار سبز

کیا خطا صیاد کی ہے دام کا ہے کیا قصور
آب و دانہ نے کیا مجھ کو گرفتارِ قفس

سربلندوں کو کیا ہے کس نے عالم میں اسیر
طائرِ سدرہ ہوا ہے کب گرفتارِ قفس

موئے کمر کی طرح سے معدوم ہو گئے — تیرے دہن کی طرح سے گویا کہ ہم نہیں
وہ دستِ دورِ ضعف نے حد سے بڑھایا پاؤں — نقشِ قدم کی طرح سے اٹھتے قدم نہیں

تھی در پہ کھڑا ہونے کی نہ جنکو اجازت — اب ان کو بٹھاتا ہے ستمگار بغل میں
گھر یار کا اب مجمعِ عشّاق ہوا ہے — دو چار مقابل ہیں تو دو چار بغل میں

بری ہیں جنّتِ اغیار سے اہلِ عروج اے دل — نہ ہووے حاجتِ روغن چراغِ ماہِ روشن کو
نہ پہونچے فائدہ سنگیں دلوں سے خلق کو ہرگز — بجھاتے پیاس کب دیکھا کسی نے آبِ آہن کو

انشا

نام سیّد انشاء اللہ خاں تخلص انشا ولد حکیم میر ماشاء اللہ خاں۔ آپ کے بزرگوں کا وطن نجف اشرف تھا اور خاندانی پیشہ طبابت۔ فنِ طبابت میں یہ خاندان ممتاز حیثیت رکھتا تھا جس کی وجہ سے شاہانِ مغلیہ تک رسائی ہو گئی دہلی کے زوال کے بعد آپ کے والد نے مرشد آباد کو اپنا مسکن بنالیا۔ اور انشا وہیں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں آپ مرشد آباد سے دہلی آگئے۔ مگر پھر دہلی کو چھوڑ کر لکھنؤ میں آباد ہو گئے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے اس کے بعد آپ نواب سعادت علی خاں کے یہاں ملازم ہو گئے۔ آپ عربی۔ فارسی ترکی اور پشتو زبانوں سے خوب واقف تھے اور ہر زبان میں کلام کہا ہے۔ مشکل زمینوں میں شعر اچھا نکالتے تھے۔ مشہور ہے کہ کچھ دنوں مصحفی سے اصلاح لیکر منحرف ہو گئے تھے اور ان کی ہجو بھی لکھی۔ انشا صاحب کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا جس کے سبب آپ کو پاگل پن کا عارضہ ہو گیا۔ ۱۲۳۳ھ یعنی ۱۸۱۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

کل ایک گھر میں خوب سے چھوٹے بڑے لڑے — ہاتھوں سے ہاتھ اور کڑوں سے کڑے لڑے

چھلنی سے چھاج، چھاج سے چھلنی الجھ گئی — مٹکوں سے مٹکے ٹوٹے گھڑوں سے گھڑے لڑے

لڑکوں سے لڑکے جھپٹے جوانوں سے سب جواں — بڈھوں سے بڈھی کڑ بڑوں سے کڑ بڑے لڑے

جھونٹوں سے جھونٹے گتھ پڑے چوٹوں سے چونٹیاں — بیٹھوں سے بیٹھے لیٹے کھڑوں سے کھڑے لڑے

حقّوں سے حقّے چلموں سے چلمیں بھی ٹوٹیاں — نیچو سے نیچے گرڑ گرڑوں سے گرڑ گرڑے لڑے

جب تُل گئی لڑائی ترازو کے تول میں — باٹوں سے باٹ ٹوٹے دھڑوں سے دھڑے لڑے

رہا ہے ہوش کچھ باقی اسے بھی اب بنبیڑے جا — یہی آہنگ اے مطرب پسر ٹک اور چھیڑے جا

تجھے اس درد میں لذّت ہے اے جوشِ جنوں اچھا — مرے زخمِ جگر کے ہر گھڑی ٹانکے اُدھیڑے جا

پڑے ہیں آشنا اپنے جو گردابِ محبّت میں — کنارے کب لگیں گے دیکھیے ان سب کے بیڑے جا

کہیں اے صبر جلدی بھاگ اپنی خیر چاہے تو — یہ دیکھ آئے ہیں فوجِ اشک کے پیہم دریڑے جا

سوالِ بوسہ سن کہنے لگا وہ شوخ غصّہ ہو — بہت اچھا سمجھ لونگا بھلا تو مجکو چھیڑے جا

وفورِ مے سے حالت غش کی ہے انشاؔ کو اے ساقی — شراب پر رنگالی کے دئے منھ پر تریڑے جا

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ بہ جبیں سہی — یہ سب سہی پر اک نہیں کی نہیں سہی

مرنا مرا جو چاہے تو لگ جا گلے سے ٹک — اب کا ہی دم یہ میرا دمِ واپسیں سہی

آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں — جو بات ہم کو کہنی ہے تم سے نہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے — اچھا تو کیا مضائقہ انشاؔ سے کیں سہی

دیوار پھاند نے میں دیکھو گے کام میرا — جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

ہمسایہ آپ کے میں لیتا ہوں ایک حویلی — اس شہر میں ہوا گر چندے سے مقام میرا

جو کچھ کہ عرض کی ہے سو کر دکھاؤں گا میں — واہی نہ آپ سمجھیں یونہی کلام میرا

اچھا مجھے ستاؤ جتنا کہ چاہو میں بھی — سمجھوں گا گر ہے انشاؔ اللہ نام میرا

پوچھا کسی نے مجھ کو اُن سے کہ کون ہے یہ — تو بولے ہنس کے یہ بھی ہے اک غلام میرا

محشر کی تشنگی سے کیا خوف سیّد انشا — کوثر کا جام دے گا مجھ کو امام میرا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں ناچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک — نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ نام کیا شے ہے — میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا — غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا — کہ پڑا ہے آج میں قدحِ شراب الٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ہے ثواب الٹا
کھڑے دیکھتے چپ ہو کیا مرے دل اجڑ گئے کو — وہ گنہہ تو کہدو جس سے یہ دہِ خراب الٹا

ضعف آتا ہے دل کو تھام تو لو — بولیو مت ذرا سلام تو لو
کون کہتا ہے کہ بولو، مت بولو — ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو
ہم صفیروں چھٹو گے مت تڑپو — دم ابھی آکے زیرِ دام تو لو
ان ہی باتوں پہ لوٹتا ہوں میں — گالی پھر دیکے مرا نام تو لو
اک نگاہ پر بکے ہے انشا — مفت میں مول اک غلام تو لو

اشعار متفرق

اس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے — واسطے دو دن کے عرشِ کبریائی مانگتا
پیدا ہوا جی عشق سے جب سنگ میں کیڑا — پھر کیونہ پڑے زخمِ دلِ تنگ میں کیڑا

ہوا جب اشک دلِ با فراغ کا بیٹا
تو کیوں نہ کہئے پھپولے کو داغ کا بیٹا

صنم خانے میں جب بولا بُتِ ناقوس کا جوڑا
لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا

اب کے یہ سردی پڑی ہر ایک تارا جل گیا
کاسۂ چرخِ بریں سارے کا سارا جل گیا

گر بادہ مے پلائے تو پھر ہم نہ کیوں پئیں
زاہد نہیں ہیں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

پھبتی ترے مکھڑے پہ جو حور کی سُوجھی
لا ہاتھ اِدھر دے کہ بہت دور کی سوجھی

انیس

نام میر ببر علی تخلص انیسؔ ولد میر مستحسن خلیقؔ۔ آپ میر حسن دہلوی کے پوتے اور میر ضاحک کے پرپوتے تھے۔ آپ ۱۸۰۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی سے حاصل کی۔ شاعری میں آپ اپنے والد خلیقؔ کے شاگرد تھے ابتدا میں غزل کہتے تھے مگر اس کے بعد مرثیہ خوانی کی طرف رجوع ہوگئے اور تمام عمر مرثیہ گوئی میں گزار دی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج مرثیہ گوئی میں آپ کا نام اور مقام سب سے افضل اور اعلےٰ ہے۔ آپ کے گھر کی زبان اردو معلیٰ کے نام سے لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان میں مشہور ہے اپنے متعلق وہ فرماتے ہیں :-

عمر گزری اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؔ کی مداحی میں

۱۸۷۴ء میں آپ نے انتقال کیا۔

رُباعیات

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے، اس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے غضب سے ترے رحمت تیری
جنت انعام کرکہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

دُنیا میں نہ چین اک ساعت دیکھا
برسوں نہ کبھی روزِ فراغت دیکھا
راحت کا مکاں امن کا گھر خانۂ عیش
دیکھا تو جہاں میں کنجِ عزلت دیکھا

سلام

واقف خمارِ غم سے نہیں دل فقیر کا — پیمانہ کش ہوں بادۂ خم غدیر کا
شہرہ ہے شش جہت میں حدیثِ غدیر کا — بیعت کو ہاتھ اٹھا تھا صغیر و کبیر کا
غل سن کے عندلیبِ قلم کے صریر کا — رنگ اڑ گیا ہے صاف مرے ہم صفیر کا
دولت سے فقر کی ہے غنی دل فقیر کا — محتاج بادشاہ کا ہوں نہ وزیر کا
جاری ہے کیا ہی فیض جنابِ امیر کا — دامن دُروں سے بھرتے ہیں ابرِ مطیر کا
جلوہ ہے اس طرف بھی جنابِ امیر کا — منہ ہے جدھر پھرا ہوا مہرِ منیر کا
بعد از نبی ہے تخت جنابِ امیر کا — سُلطاں کی مملکت میں عمل ہے وزیر کا
کعبہ میں دوشِ پاکِ نبی پر رکھے قدم — اے چرخ دیکھ اوج مرے دستگیر کا
آہ و بکا سے حشر تھا کوفے کی راہ میں — تابوت لے چلے جو نبی کے وزیر کا
قیدی دہائی دیتے تھے روتے تھے سب فقیر — لے لیکے نامِ پاک جنابِ امیر کا
پوچھے کوئی پتا تو یہ کہہ دیجیو انیس — ہے وادی السلام بستر فقیر کا

گرمی کا سماں

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خشخانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تابِ تب کی تاب — چھپنے کو برق ڈھونڈتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

داخلہ کربلا

اترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمّت کا ناخدا — جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا — دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
اکبرؔ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؔ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ حق پسند — کیوں یہ مقام ہے تمہیں شائد بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ اے شاہِ ارجمند — بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
شیر اب یہیں رہینگے عنائت جو رب کی ہے
بس کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام — گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام — شکلیں وہ نور کی وہ تجمّلِ وہ احتشام
زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

فوج کی تیاری

امڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل — تھے برچھیوں کے صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جنکی آب میں تھی تلخیِ اجل — وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
دو دو تیر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے نچھے ہوئے حلقے کمند کے

حد سے فزوں ہے کثرتِ فوجِ نابکار — نیزے پہ نیزہ تیغ پہ ہے تیغِ آبدار
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثلِ شاخسار — ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم ہیں جیسے کہ ہوں گل کھلے ہوئے
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں
نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں
سنگیں دلوں نے ہاتھ میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اٹھائے ہیں

حملہ کا زور

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر
تھیں موج کی طرح سب اِدھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور
پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

تھا شش جہت میں غل کہ یہ ہے روزِ انقلاب
الٹے گا اس زمیں کا ورق ابنِ بوتراب
اس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتحیاب
بس اب بنائے عالمِ امکاں ہوئی خراب
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

ہلتی تھی جائے امن نہ زیرِ فلک کہیں
غل تھا کہ ہل نہ جائے سما سے سمک کہیں
جنات بے حواس کہیں تھے ملک کہیں
سایہ کہیں تھا تیغ کہیں تھی چمک کہیں
پانی سے جل بجھا تھا کوئی، کوئی نار سے
گرتی تھیں تین بجلیاں اک ذوالفقار سے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا جنوں سے گھر
شیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر
اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سمٹے پہاڑ منھ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دئے پر کانپ کانپ کے

غزلیات کے تین شعر

ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے
پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی — نورتن آج جو ڈھلکا ہے ترے بازو کا
کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا — آج کی شب تو نکل جاؤ مرے پہلو سے

بحر

شیخ امداد علی تخلص بحر خلف شیخ امام بخش شاگرد حضرت ناسخ لکھنوی باشندہ لکھنؤ۔ آپ کے ایک مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا خاص وطن فیض آباد ہی تھا۔ فرماتے ہیں۔

پوچھتا ہے عبث حالِ خرابیِ وطن — بحر ہی جب نہ رہے کیا فیض آباد رہے

آپ نامور استاد ہوئے ہیں مگر باوجود فنکار ہونے کے زندگی بے لطف گذری۔ ہمیشہ تنگ معاشی کا شکار رہے۔ آخر نواب تاجدار بہادر رام پور کی دستگیری سے زندگی گزاری۔ ۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ پریشانی کا یہ عالم تھا کہ اپنا دیوان بھی جمع کر کے ترتیب نہ دے سکے۔ رندؔ صاحب سے آپ کو بڑا خلوص تھا لہٰذا انہوں نے آپ کا دیوان جمع کر کے ترتیب دیا۔ بحر صاحب خود فرماتے ہیں۔

جامع اس دفتر کے ہیں سید محمد خاں رندؔ — اس سراپا لطف کا یہ بحر پر احسان ہے
آنکھ کھلتے ہی میسر ہوا دیدارِ قفس — ہوئے مژگاں مری قسمت سے ہوئے تارِ قفس
کہے دیتی ہے بنائے قفس تابوتی — مر گئے پر بھی نہ چھوٹیں گے گرفتارِ قفس
ہم صفیرو کوئی کیا جانے اسیری کا مزا — میں چمن بیچ کے ہوتا ہوں خریدارِ قفس
پر خدا دے تو نہ اڑ جائیں کہ اسی میں ہے نجات — کب ہوا بلبلِ تصویر گرفتارِ قفس
یاں ہر اک عیش کے انجام کا آغاز ہے کم — راحتِ باغ کو بلبل سمجھ آزارِ قفس
رو بہ صحت ہوئے زنداں سے جو مر کر نکلے — گور میں نقل مکاں کرتے ہیں بیمارِ قفس

خدا کسی کو نہ روزِ سیاہ دکھلائے — گہن میں چاند ہے تارے شریکِ حال نہیں
ہوئے ہیں ایسے مجھے زندگی کے دن بھاری — کسی سے لاش بھی اٹھے یہ احتمال نہیں
جو اس مقام پہ آیا ہے ہاتھ ملتا ہے — ہتھیلیوں میں کسی آدمی کے بال نہیں

ہمارے سوزِ دروں کا نہ پوچھیے عالم ۔۔۔ دھواں دماغ سے اٹھتا ہے سر کے بال نہیں
جو منچلے ہیں سپاہی کسی سے ڈرتے ہیں ۔۔۔ جہاں میں سبزۂ شمشیر پائمال نہیں
ہوائے عیش کو سر سے نکال ہوش میں آ ۔۔۔ سحر ہے شام جوانی سپید بال نہیں
ہر اک لاف زنی کرے اپنے گھر میں سحر ۔۔۔ نکل کے منھ سے جو بولے زباں مجال نہیں

ایک دن مجھ کو پھنسائینگی مقرر پلکیں ۔۔۔ آنکھیں صیاد ہیں ٹٹی ہیں ستمگر پلکیں
تو وہ بے دید ہے جس وقت پھری تیری نظر ۔۔۔ تل بھر آنکھیں کریں رحم نہ جو پھر پلکیں

بُتو خدا پہ نہ رکھو معاملہ دل کا ۔۔۔ بُرا بھلا یہیں ہو جائے فیصلہ دل کا
خدایا نالہ و فریاد ساز دار کر دے ۔۔۔ کہ دل لگی ہے ہماری یہ مشغلہ دل کا

پردہ بھی روزِ وصل نہ اٹھا کسی طرح ۔۔۔ سرکا نہ سینے پر سے دوپٹہ کسی طرح
کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی ۔۔۔ پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

اشعار متفرق

کچھ ریاضت سے نہیں پشت خمیدہ زاہد ۔۔۔ بارِ عصیاں وہ اٹھایا کہ ہوئی چور کمر
ایسے عمامے سے تو لنگوٹا ہی خوب ہے ۔۔۔ زاہد کے ہاتھ چھوڑ کے لیں برہمن کے پاؤں
ماہ کو نقرہ، مہر کو زر دو ۔۔۔ جس کو چاہو اس کو بھر دو
محفل میں بیٹھ کر یہ اشارے بھلے نہیں ۔۔۔ فتنے اٹھیں گے یار اس آفت کی آنکھ سے
مجھ سے ہنستے ہیں تو منھ سرخ ہوا جاتا ہے ۔۔۔ خوش ہیں ظاہر میں دلے آگ بگولا دل میں
دم نکلے ہجوم غم میں کیونکر ۔۔۔ کچھ بھیڑ چھٹے تو راستہ ہو

برق

مرزا محمد رضا متخلص برق۔ خطاب فتح الدولہ بخشی الملک بہادر۔ آپ مرزا کاظم علی صاحب کے صاحبزادے تھے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ بڑے جری

اور مہذب مشہور تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ قلعہ کلکتہ میں رفیق رہے سنہ ۱۸۵۷ء میں بمقام کلکتہ میں وفات کی۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

مے کشو آیۂ رحمت ہوں غنیمت سمجھو
سال بھر روز لگاتی ہے جھڑی مری آنکھ
چشم پوشی نہ کرو مجھ کو دکھا دو صورت
آپ سے رکھتی ہے امید بڑی مری آنکھ

پردہ تو پردہ اور سنو لنترانیاں
آتے نہیں ہیں خواب میں شرم کے سامنے
یکساں ہیں بادشاہ و گدا جوشِ عشق میں
پست و بلند ایک ہیں دریا کے سامنے

دیکھئے حالتِ دل درد میں کیا ہوتی ہے
روح تا ہم شبِ فرقت سے فنا ہوتی ہے
میں جو روتا ہوں تو کہتے ہیں ہنس ہنس کے
جو کرے عشق یہی اس کی سزا ہوتی ہے

اشعار متفرق

میں تو کیا پیچ سے بالوں کے نکلنا ہے محال
پیر بھی آئیں اگر اے مہِ تاباں سر پر
قیس کا نام نہ لو ذکرِ جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسمِ گل آنے دو
ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے الفت میں
تم جو غیروں سے ملے تم کو نہ غیرت آئی
یادِ مژگاں آشنائے بحرِ الفت ہے مجھے
مغتنم دریا میں تنکے کا سہارا ہو گیا
کچھ پستیِ نصیب سے اپنے عجب نہیں
بدلے جبیں کے ہو خطِ تقدیر پاؤں میں
اوڑھی کرتی لال کچیں اور اس پہ سنہری گوٹ لگی
ابر سے نکلا چاند کا ٹکڑا برق کے دل کو چوٹ لگی

شہر آشوب برقؔ جو غالباً بعد خرابیِ لکھنؤ کہا گیا تھا (چند بند)

کل کے مذکور یہ ہیں، اپنے بھی افسانے تھے
رشکِ فردوسِ بریں شہر کے میخانے تھے
تھالیاں ہیروں کی تھیں لعلوں کے پیمانے تھے
ماہ و خورشید رخِ شمع کے پروانے تھے
سب ہوا خواہ سلیمان کہا کرتے تھے
رات دن پریوں کے جھرمٹ میں رہا کرتے تھے

قہقہے اڑتے تھے جمگھٹ کے پری زادوں کے
میلے ہر روز ہوا کرتے تھے آزادوں کے
نالے سنتے نہ تھے ہرگز کبھی فریادوں کے
کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے

کیا کہیں کس سے کہیں ہائے وہ صحبت کیا تھی
راجہ اندر کے اکھاڑے کی حقیقت کیا تھی

باغِ جنت کے اثر باغِ ارم رکھتا تھا — سارے عالم کے ثمر باغِ ارم رکھتا تھا
ساری دنیا کے شجر باغِ ارم رکھتا تھا — گل خوشوقتِ سحر باغِ ارم رکھتا تھا

دیکھ کر صحن کو بیمار شفا پاتے تھے
مُردے جی اٹھتے تھے جس وقت وہاں جاتے تھے

چاند تھی شکل میں ہر اک کہاری اپنی — دیکھنے آئی تھیں پریاں بھی سواری اپنی
ہم نفس باغ میں تھی بادِ بہاری اپنی — صحبتیں غیرتِ فردوس تھیں ساری اپنی

دھوم تھی چاروں طرف خلق میں رہواروں کی
حرص تھی روحِ سلیماں کو ہواداروں کی

یاد آتا ہے وہ ہنس ہنس کے بگڑنا ان کا — لہنگے پہنے وہ تمامی کے اکڑنا ان کا
بہرِ انعام سواری میں جھگڑنا ان کا — قہر تھا ہائے بناوٹ کا وہ لڑنا ان کا

بجلیاں عارضِ انور سے چمک جاتی تھیں
کمریں بارِ سرِ گیسو سے لچک جاتی تھیں

سقّے کیوڑے سے چھڑکتے تھے ہماری سڑکیں — آنکھوں سے جھاڑتی تھی بادِ بہاری سڑکیں
غیرتِ گلشنِ فردوس تھیں ساری سڑکیں — رہتی ہیں پیشِ نظر ہائے وہ پیاری سڑکیں

لکھنؤ کی انھیں گلیوں میں پھرا کرتے تھے
غش میں آ کے تماشائی گرا کرتے تھے

بیڑے ہم چھوڑتے تھے گومتی پر بھادوں میں — جلسے رہتے تھے شب روز پریزادوں میں
مشق کرتے تھے فنِ عشق کی استادوں میں — شب گزرتی تھی ہمیں زلف کے آزادوں میں

بے فکری کبھی اُن روزوں میں آرام نہ تھا
رات دن سیر سپاٹے کے سوا کام نہ تھا

جانتے تھے کہ اسی طرح گزر جائے گی — یہ چمنِ عیش میں ہرگز نہ خزاں آئے گی
آرزو نخلِ محبت سے ثمر پائے گی — یہ نہ سمجھے تھے فضا رنگ نیا لائے گی

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

آج پانی بھی نہیں منہ میں چوانے والے دور سے بھاگتے ہیں پاس کے آنے والے
منہ نہیں دیکھتے صورت کے دکھانے والے پھاڑے کھاتے ہیں محبت سے کھلانے والے

غم میں کیوں کر نہ مژہ اشکوں سے تر ہو اپنی
مر بھی جائیں تو کسی کو نہ خبر ہو اپنی

سخت جاں سے فقط جیتے ہیں یہ جینا کیسا پانی خنجر ہے ہمیں پیاس میں پینا کیسا
اب وہ لو چندی کہاں اور وہ مہینا کیسا مے کہاں جام کہاں قلقلِ مینا کیسا

موت قابو میں نہیں ورنہ بڑی بات نہ تھی
جائے عبرت ہے کبھی اپنی یہ اوقات نہ تھی

اب بھی آجائیں جو وہ پھر وہی صورت ہو جائے وہی ہنسیاں وہی چہلیں وہی عشرت ہو جائے
رنج سب جاتے رہیں روح کو راحت ہو جائے پھر وہی شان ہو اپنی وہی شوکت ہو جائے

پھر وہی سیریں کریں پھر وہی آبادی ہو
پھر وہی ناچ وہی رنگ وہی شادی ہو

آئی اس رنجِ غم اندوز کی تدبیر نہیں جیتے جی ان سے ملیں اپنی یہ تقدیر نہیں
دَور اپنا ہو کہ دَورِ فلکِ پیر نہیں دل میں طاقت نہ رہی آہ میں تاثیر نہیں

کس نے آرام تہہ چرخِ کہن پایا ہے
روزِ اوّل سے اِسی طرح چلا آیا ہے

ہم پہ اے برق جو گزرا ہے ستایا ہم نے نقشہ سب کھینچ کے شعروں میں دکھایا ہم نے
شہر آشوب کہا رو رو کے رُلایا ہم نے وقت پر دوستوں کو دوست نہ پایا ہم نے

خلق میں نیّرِ اقبال ہمارے وہ تھے
سب کو ثابت ہے کہ سیّارستارے وہ تھے

بقاؔ

نام شیخ محمد بقا اللہ متخلص بقاؔ خلف حافظ لطف اللہ. معاصر سودا و میر وطن اکبر آباد۔ مولد دہلی. مسکن لکھنؤ۔ اردو شاعری میں شاہ حاتمؔ اور میر دردؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ فارسی زبان میں مرزا فاخر مکیںؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

یہ رُخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے
ہے نہاں شام وطن شامِ غریباں کے تلے
آہ کی برق جو سینہ میں چمکتی دیکھی
طفلِ اشک آن چھپے دامنِ مژگاں کے تلے
شیخ ڈرتا ہوں کہیں بیٹھ نہ جائے یہ کنواں
مت کھڑا ہو تو عصا رکھ کے زنخداں کے تلے

شب گذری ہے اے سحر کے نالو
پھر عرش پر برچھیاں سنبھالو
گر قتل کیا بقاؔ کو خوبو
اس بات کو مت زبان سے نکالو
پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق
بس جانے دو اس پہ خاک ڈالو

اشعار متفرق

جیبِ ناصح جو مرے ہاتھ کو اک بار لگا
پھاڑوں ایسا کہ پھر اس میں نہ لگے تار لگا
سرسری مل کے مرے پاس سے جانا کیا تھا
راہ بس ناپنے آئے تھے یہ آنا کیا تھا
آئینہ دیکھ کے کہتا ہے جو "اللہ رے میں"
اُس پریزاد پہ میں غش ہوں بقاؔ واہ رے میں
اے عشق تو ہر چند مرا دشمنِ جاں ہے
مرنے کا نہیں نام کا اپنے میں بقاؔ ہوں
مجھ سے کب تک اس دلِ صد چاک کا پیوند ہو
اب یہ دیوانہ الٰہی خاک کا پیوند ہو
تو نے اس طرح سے اے چرخ گرایا مجھ کو
کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اٹھایا مجھ کو
ترے خالِ سیہ لب پہ آشکارا ہے
کسی کے بختِ سیہ کا مگر ستارا ہے
گر دو گے بقاؔ کو تم نزع کے دم بوسہ
تو اُس کے تئیں گویا تم آبِ بقا دو گے
کیا خط تجھے لکھنے حرکت ہاتھ سے کم ہے
خامہ بھی مرے ہاتھ میں انگشتِ ششم ہے

یاد میں تڑپے ہے یہ کس ابروئے خمدار کے
آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کے

ہوتا ہے شیشۂ دل چور اس کی گفتگو سے
یارب یہ پندِ ناصح یا سنگِ محتسب ہے

عشق میں بو ہے کبریائی کی
عاشقی جس نے کی خدائی کی

ہمسری مت صبا سے کر اے آہ
تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی

تاباں

نام میر عبدالحی باشندہ دہلی شاگرد مرزا سودا۔ آپ بہت خوبصورت انسان
زمانہ آپ کی خوبصورتی کا دیوانہ اور عاشقِ زار تھا۔ جوانی میں وفات کی
صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

ابرو نے ترے مجھ پہ کیا وار بے طرح
دل میں مرے لگی ہے یہ تلوار بے طرح

ممکن نہیں کہ عشق کے ہاتھوں سے جی بچے
پیدا ہوا ہے مجھ پہ یہ آزار بے طرح

عالم تمہارے تیغ میں آوے گا آج جاں
زاہد کی فکر میں ہے وہ میخوار بے طرح

کیا جانیے کہ آج کس عاشق کی ہے اجل
کیفی ہوا ہے اب تو مرا یار بے طرح

ممکن نہیں قفس سے کہ گل تک پہونچ سکے
بلبل ہوئی ہے اب کے گرفتار بے طرح

غارت خدا کرے یہ ترے ملکِ حسن کو
ہے فوج خط کی گرد نمودار بے طرح

تاباں بتا کہ یار کو کیونکر منائیے
اب کے ہوا ہے مجھ سے وہ بیزار بے طرح

سن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

بیمار ہے زمیں سے اٹھتی نہیں عصا بن
نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں

آئینہ روبرو رکھ اور اپنی چھب دکھاتا
کیا خود پسندیاں ہیں یا خود نمائیاں ہیں

جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہے
بے اختیار کلیاں تب کھل کھلائیاں ہیں

کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے
اب کس کے ساتھ پیارے وے دلربائیاں ہیں

عاشق سے گرم ملنا پھر بات بھی نہ کرنا
کیا بے مروتی ہے کیا بے وفائیاں ہیں

افسوس اے صنم تم ایسے ہوئے ہو ابتر
ملئے تو غیر سے جا ہم سے رکھائیاں ہیں

اب مہرباں ہوا ہے تاباںؔ ترا ستمگر　　آہیں تری کسی نے شاید سُنائیاں ہیں

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیئے　　کس طرح جاتا ہے دل بیدل سے پوچھا چاہیئے
کیا تڑپنے میں مزہ ہے قتل ہو پیارے کے ہاتھ　　اس کی لذّت کو کسی بسمل سے پوچھا چاہیئے
جس نے اس کا زخم کھایا ہے اُسے معلوم ہے　　تیغ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہیئے
یار کے ملنے کی ہم کوئی طرح پاتے نہیں　　طرح ملنے کی کسی واصل سے پوچھا چاہیئے
آہ و نالے کی حقیقت دیکھتا ہوں ہجر میں　　کیا گزرتی ہوگی تاباںؔ دل سے پوچھا چاہیئے

مت کر فغاں تو باغ میں زنہار عندلیب　　صیّاد ہو مبادا خبر دار عندلیب
سیرِ چمن کو چھوڑ مرے گل بدن کو دیکھ　　تو کس بلا میں رہے گی گرفتار عندلیب
آتا ہے رحم مجھ کو کہ گلچیں کے ہاتھ سے　　تو کھینچتی ہے سخت یہ آزار عندلیب
تنہا تو ہی خراب نہیں، گل رخوں کے ہاتھ　　تاباںؔ بھی ہے اسی طرح سُن خوار عندلیب

نہیں ہے دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا　　سُناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا بیاں اپنا
بہت چاہا کہ آوے یار یا دل کو صبر آوے　　نہ یار آیا نہ صبر آیا دیا جی میں ندان اپنا
قفس میں تڑپلے ہیں یہ عندلیباں سخت بے بس میں　　نہ گلشن دیکھ سکتے ہیں نہ یہ اب آشیاں اپنا
مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پہ اے تاباںؔ　　نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ تن اپنا نہ جاں اپنا

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا　　میرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا
میں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح　　یارب کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
ناصح عبث نصیحتِ بے ہودہ تو نہ کر　　ممکن نہیں کہ چھوٹ سکے دل لگا ہوا
ہم بے کسی پہ اپنی نہ روئیں تو کیا کریں　　دل سا رفیق ہائے ہمارا جدا ہوا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا
تیری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

سبب جو میری شہامت کا یار سے پوچھا
کہا کہ اب تو اسے گاڑ دو ہوا سو ہوا

یہ دردِ عشق ہے مرا نہیں علاج طبیب
ہزار کوئی دوا کرو ہوا سو ہوا

بھلے بُرے کی ترے عشق میں اڑا دی شرم
ہمارے حق میں کوئی کچھ کہو ہوا سو ہوا

اشعار متفرق

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں
ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار میں

ہاتھ میں اس کے ہاتھ تھا ہیہات
دل مرا اگرم ہوا ہے ہاتھوں ہات

لے دل کی خبر چشم مرے یار کی کیوں کر
بیمار عبادت کرے بیمار کی کیوں کر

دیکھ قاصد کو مرے یار نے پوچھا تاباں
کیا مرے ہجر میں جیتا ہے وہ غمناک ہنوز

غم وصل میں ہے ہجر کا ہجراں میں وصل کا
ہرگز کسی طرح سے مجھے آرام ہی نہیں

انجان ہو تو اس سے کوئی دردِ دل کہے
جو جانتا ہوا اس کو میں آگاہ کیا کروں

ملایا خاک میں گھر کوہکن کا ہائے خسرو نے
یہ کیا بات آگئی اس خانہ ویراں آباد کے دل میں

ظالم وفا کا میری جو لیتا ہے تو حساب
اپنے جفا و ظلم کا بھی کچھ شمار ہے

کس سے فریاد کروں یہ کہ وہ ہرجائی ہے
آہ اس بات میں تو میری بھی رسوائی ہے

تیرے ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز
گوشت ناخن سے کہو کیونکر جدا ہوتا ہے

تسکین

نام میر حسن تخلص تسکینؔ۔ باشندہ دہلی۔ شاگرد حضرت شاہ نصیرؔ و مومنؔ۔
آپ میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر کی اولادوں میں تھے۔ ۱۸۵۲ء میں وفات کی۔

اشعار متفرق

کر سکے دفن نہ اس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

نام تسکینؔ اور یہ مضمونِ تپش نازیبا
تھا تخلص جو سزاوار تو بیتاب مجھے

ہر صبح وہ ڈھونڈے ہے کوئی تازہ خریدار — صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

قسمت تو دیکھ کہ جتنے کیے شکوے ہجر کے — ان کو گماں رہا گلۂ روزگار کا

خوبصورت نہ ہو کوئی تو نہ ہو بدنامی — سچ تو یہ ہے کہ بُرا ہوتا ہے اچھا ہونا

کہتے ہیں رنجش ظاہر میں مزہ آتا ہے — یونہی تم مجھ سے خفا ہو کے ذرا مل جانا

یہاں آنے سے کس واسطے جلتا ہے ہمارے — عاشق تو نہیں ہے کہیں دربان تمہارا

ہزاروں مر گئے دیکھا جو عالم سوگ میں اس کا — لباس آیا وہ کافر پہن کر جب میرے ماتم کا

چپ لگی مجھ کو تو چرچا یہی پھر واں ہوگا — راز اپنا نہ خموشی سے بھی پنہاں ہوگا

آج جو عرش پہ ہے اپنا دماغ اے ظالم — کوئی دشمن تری نظروں سے گرا ہووے گا

دیکھو تو لے ہے جان ملک الموت کس طرح — تم وقتِ مرگ پاس سے اٹھنا ذرا نہیں

یاں انتظار ہی میں کٹی مجکو ساری رات — واں وعدہ کیا کیا تھا انھیں یاد ہی نہیں

یہ تو سچ ہے کہ تم جو چاہو گے کر گزرو گے — پر یہ ممکن نہیں کہ ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

دیکھتے ہی شوق نے ایسا کیا بے اختیار — حالِ دل کہنے لگے ہم یار کی تصویر سے

وہ اپنے وعدہ پر محشر میں جلوہ فرمائیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے

دل کے لیتے ہی چلی جان یہ جلدی کہ نہ پوچھ — صبر بھی چند قدم پیچھے رہا جاتا ہے

تسلیم

نام منشی احمد حسین عرف امیر اللہ تخلص تسلیم ولد مولوی عبد الصمد انصاری شاگرد حضرت نسیم دہلوی۔ آپ فیض آباد کے قریب ایک گاؤں میں سنہ ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور عربی کی کتابیں اپنے بھائی مولوی عبد الطیف سے پڑھیں اور فن خوشنویسی منشی عبد الحیٔ سندیلوی سے حاصل کیا۔

مدتوں تک لکھنؤ میں رہے پھر منشی امیر مینائی کے ذریعہ نواب رام پور کے دربار میں پہونچ گئے۔ وہاں آپ کو تیس روپیہ ماہوار اور دو سو روپیہ عید پر ملتے رہے پھر وہیں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر بنا دیے گئے اور تنخواہ میں بیس روپیہ ماہانہ کا اضافہ ہو گیا۔ آپ نے پانچ دیوان اور بہت سی مثنویاں لکھی ہیں سنہ ۱۹۱۰ء میں ۹۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

بے حس کو مزہ درد کا حاصل نہیں ہوتا
تصویر کے پہلو میں کبھی دل نہیں ہوتا

دیکھا نہ کبھی تشنۂ جاوید کو سیراب
طوفاں سے بھی تر لبِ ساحل نہیں ہوتا

آوارہ مزاجوں کو نہیں قیدِ مکاں کی
نالہ کبھی پابندِ سلاسل نہیں ہوتا

ہر چند کہ ہوں عشق میں آپ سے غافل
آپ سے دم بھر کبھی غافل نہیں ہوتا

لو نزع کے عالم میں پھری جاتی ہے پُتلی
سچ ہے کوئی اپنا دمِ مشکل نہیں ہوتا

اے قیسِ حزیں آہ کے جھونکوں سے الٹ دے
کچھ بارِ گراں پردہ، محمل نہیں ہوتا

قرباں حبابِ لبِ دریا، کہ بپئے سر
محتاجِ دمِ خنجرِ قاتل نہیں ہوتا

طے کرتی ہے بے جنبشِ پا راہِ فنا کو
شبنم کو غمِ دوری منزل نہیں ہوتا

کیا غیرتِ ساحل ہے کہ اس تشنہ لبی پر
دریا سے کبھی قطرہ کا سائل نہیں ہوتا

ممسک کو دیا چرخ نے خرمن تو ہمیں کیا
یک دانہ کبھی ماہ سے حاصل نہیں ہوتا

دلِ کلیم کے ہوتے ہوئے خدا کی شان
پسند جلوہ فروشی کو کوہِ طُور آیا

نہ پوچھو پیرِ خرابات کے تصرّف کو
وہاں سے نشہ میں شیخِ حرم بھی چور آیا

ہوا یہ مردمِ دیدہ کو دیکھ کر پیدا
عدم سے پردۂ ظلمت میں چھپ کے نور آیا

بڑی امید تھی محشر میں سامنا ہوگا
وہاں بھی کام نہ میرے میرا قصُور آیا

اشعار متفرق

پوچھیں کیا اللہ سے تسلیم رازِ نیک و بد
ہر بشر کے ساتھ اک جاسوس ہے ہمزاد کا

نہیں معلوم بگڑی آج کس سے
مزہ ہے دشمنی میں دوستی کا

اجل خفا ہے فلک مدعی زمیں دشمن
مرا جہان میں کوئی نظر نہیں آتا

ہیں عاشق، اپنے مطلب کی کہیں گے
تمنّا کیا ہماری مدّعا کیا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دستِ جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

اک دورِ سرسری میں نہ گل ہے نہ یہ چمن
پھولی ہوئی ہے کس پہ نسیمِ بہار تو

اے جان شب فراق کا صدمہ نہ پوچھئے — وہ حال تھا کہ موت بھی بالیں سے ٹل گئی
اتنے صدمے دیئے کہ آخر کو — ہاتھ اٹھانا پڑا دعا کے لئے

تنویر

نوازش حسین خاں تخلص تنویر باشندہ دہلی۔ استاد ذوق کی وفات کے بعد آپ نے بہادر شاہ ظفر کے کلام پر اصلاح دی تھی۔

اس کی نظریں کہے ہیں دل دے دو — یاں کوئی مفت بر نہیں آتا
وہ کمر ہر قدم پہ لچکے ہے — فرق بال بھر نہیں آتا
حسن کیا شے ہے دل والوں کو — بن دیئے دل بشر نہیں آتا

جی اُٹھی کیونکر حسرت مردہ — اس کے گھر میں داب آیا تھا
دل ستم سہوے اس پہ اے تنویر — ابھی خانہ خراب آیا تھا

تھا وہ الجھاؤ بلا کیا زلف افسوں کار کا — سو بناؤ تھے بگڑنا اس پری رخسار کا
خاک ڈالو ان شکایاتوں پہ لگ جاؤ گلے — لو تمہی منصف ہو اب یہ وقت ہے تکرار کا

اشعار متفرق

وہ آئینہ رُخ کیا ہے طلسم حیرت — جو اسے دیکھے ہے ہو جائے ہے حیران کیسا
اٹھتے ہی اس کے سارے نشے ہو گئے ہرن — باقی رہا نہ کچھ بھی لگاؤ خمار کا
چلیں ہیں کعبہ کو تنویر آج کہتے ہیں — وہ کل تو پوچھیں تھے رستہ میخانہ کا
جھٹکے دیئے ہیں آج تو شانے نے ان کے خوب — تیرا بھی بل اے کاکل پیچاں نکل گیا
وہ جیت گئے پالنسہ تقدیر سے تنویر — پاس ان کے تو ایک اک دام ہو ہی چکا تھا
جنس دل دو نگا نہ بے بوسہ کا کل تم کو — سمجھئے اس کو نہ سودا کسی بازاری کا
ابھی ہو جاؤں ہیں اچھا ملک الموت ہو غش — اتنا کہہ دیویں وہ آ کر کہ تو بیمار ہے کیا
ساغر مے میں نظر آتے تھے لہراتے سانپ — چھوڑ کے رُخ پہ جو وہ کاکل خمدار جھکا

ایک مدت تک یہی تر چشم — سبز نخل مژہ کبھی نہ ہوا

حال تنویر سن کہے ہیں غیر — تھام کر دل کو کیا کہا صاحب

تنویر واں بھی رہویگا حوروں کا جھمگھٹا — جنت میں ہم شراب پئیں گے مدام خو

بت بولے تو دل چھین لیا شرم نے ان کی — کیا ہونا جو بے ساختہ کرتے وہ اگر بات

چار عنصر سے بنا یہ پتلۂ آدم تنویر — کہ جداگانہ بنے چاروں کے چار مزاج

کچھ نہیں ہوگا جو ہے اپنا مقدر سیدھا — لاکھ ٹیڑھی دیں اسے اس کے صلاح کار

ذکر اغیار سے چھڑکا کیسے زخموں پہ نمک — دم کشتن نہ سنی کشتۂ تلوار کی عرض

تنہا

نام محمد عیسیٰ تخلص تنہاؔ۔ شاگرد حضرت مصحفی۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنوی ہو گئے۔ حضرت ناسخ کے دوستوں میں تھے۔

تم تو کہتے ہو کہ گھر جاویں — ہم کو کہدو ہم کدھر جاویں

ذبح کرتا ہے تو، مجھے ڈر ہے — ہاتھ تیرے نہ خوں سے بھر جاویں

منہ لگا دیں انہی کو آپ افسوس — بوسہ لیکر کے جو مکر جاویں

ہے گندھے رہنے ہی میں چین ان کے — بال بکھریں تو جی بکھر جاویں

دست بوسی ہمیں نصیب نہ ہو — غیر کے ہاتھ تا کمر جاویں

خانہ آباد چھوڑ تیری گلی — کس اجڑے ہوئے نگر جاویں

حیف ہے آپ اس شب مہ میں — بام پر آکے یوں اتر جاویں

ہم کو اک بار جھانکنی وہ گلی — کچھ ہوا اس میں جئیں کہ مر جاویں

سیر تب ہے کہ مردہ بلبل کے — اڑتے گلشن میں بال و پر جاویں

یہ نالے ہیں گر اشارہ کروں — پار افلاک کے گزر جاویں

میسّر گر نہ ہو لب سے لب دلدار کو ملیے — تو بہتر ہے گلے سے خنجر خونخوار کو ملیے

یہی آتا ہے جی میں اس کو رسوا کیجیے اس صورت — کہ لوہو اپنا لے اس کے در و دیوار کو ملیے

وہ کیسے ناز سے سوئے ہیں مجھ پہ پاؤں رکھ کے
یہ جی میں آئے ہے آنکھوں سے پائے یار کو ملیے

بنے ہو سوانگ اگر جوگی کے تو بینے ونے پیارے
بھبوت اپنی نہ لیکر اس طرح رخسار کو ملیے

اگرچہ مجھ میں حس کب ہے یہ شوق ذبح رکھتا ہوں
گلا اب اپنا اس خونریز کی تلوار کو ملیے

یہ ہم نے جی میں ٹھانا ہے کہ اب کے وہ اگر آویں
نہ اتنا آب رو روچشم گوہر بار کو ملیے

یاں ہم بخار دل کا آکر نکالتے ہیں
آپ اس گلی سے ہم کو باہر نکالتے ہیں

جب دیکھو اک نہ اک کو ہر روز قتل کرنا
آپ اپنے دن بدن یہ جوہر نکالتے ہیں

طومار شکوہ تم نے گروا کیا تو ہم بھی
یہ لو بغل سے اپنی دفتر نکالتے ہیں

ان قیدیوں کو کتنی پرواز کی ہے خواہش
چاکِ قفس سے باہر نت سر نکالتے ہیں

باروئے گرم سورج گردن کو بیش آوے
تو شب کو ہم یہ آنکھیں اختر نکالتے ہیں

ہیں لالچی یہاں کے سب اہلِ کار تنہا
کب کام یہ کسی کا بے زر نکالتے ہیں

شعلہ سا وہ بدن ہے واں پیرہن کے اندر
یاں آگ بھڑک رہی ہے اپنے بدن کے اندر

آتش سے میرے دل کی سیماب ہو اڑے گا
کافور کو نہ رکھنا میرے کفن کے اندر

برگشتہ آسیا سے ہیں بسکہ اپنے طالع
رہتے ہیں ہم سفر میں ہر دم وطن کے اندر

صیاد سے کہے تھی بلبل یہی کہ ظالم
رکھ دے مرے قفس کو اک دم چمن کے اندر

فانوس سے ہو شعلہ جیوں شمع کا نمایاں
چمکے ہے یوں وہ بنڈا اس پیرہن کے اندر

جل جل کے شمع سے شب پروانے گر رہے تھے
کتنے لگن کے اندر کتنے لگن کے باہر

دامن کشی کا کس کی مشتاق میں ہوا ہوں
ابتک ہیں ہاتھ میرے چاکِ کفن کے باہر

بلبل کا اس سوا کچھ میں نے نشاں نہ پایا
اک مشت پر پڑے ہیں صحنِ چمن کے باہر

ہم تم ابھی تو تنہا بیٹھے ہیں لکھنؤ میں
قدرِ وطن تو تب ہو جب ہوں وطن کے باہر

اشعار متفرق

تھم کے بے وجہہ تڑپتے نہیں بسمل تیرے
آبِ خنجر سے یہ رہ رہ کے مزا لیتے ہیں

ان دنوں چاک ہے پیراہنِ گل آہ تنہا
ہم کوئی اپنے گریباں کو سلا سکتے ہیں

غیر سے شکوہ مرا دیکھ لی دانائی تری
میں ہوا رسوا تو کیا ہو گی نہ رسوائی تری

حشر میں کس لئے آہ بھٹکتے پھرتے
اپنا منھ ہم سے یہاں گر نہ چھپاتا کوئی

میں جو روٹھا تو مناکر مجھے وہ یوں بولا
کہیئے کیا کرتے جو تم کو نہ مناتا کوئی

افسوس کی جگہ ہے یہ تنہا کہ چھٹ گیا
ہاتھ اس کا آکے مرے کئی بار ہاتھ میں

ثاقب

نواب شہاب الدین احمد آنریری مجسٹریٹ دہلی متخلص ثاقب خلف الرشید نواب ضیاالدین خاں بہادر. شاگرد مرزا اسد اللہ خاں غالب.

کیوں ویسے آدمی نہیں آتے بروئے کار
آخر وہی زمیں ہے وہی آسماں ہے اب

سیمرغ و زال و رستم و برزو کدھر گئے
کہنے کو ایک ہوش فزا داستاں ہے اب

دیکھا ہے کس نے موسیٰ و فرعون کو کہیں
ہاں رودِ نیل روئے زمیں پر رواں ہے اب

نہ بت گری نہ بت شکنی قصۂ مختصر
صرف آزر و خلیل کا مذکور یاں ہے اب

ہیں ظلم و معدلت کی حکایت اور بس
حجاج ہے جہاں میں نہ نوشیرواں ہے اب

ضرب المثل ہے لیلیٰ و مجنوں کا حسن و عشق
اس کا نہ کچھ پتا ہے نہ اُس کا نشاں ہے اب

کیا کہہ رہا ہوں میں کہ ہے اور وہ نہیں
توحید کے خلاف ہے سب جو بیاں ہے اب

نفی وجودِ غیر ہے ثاقب طریقِ حق
آثار کی نمود بھی وہم و گماں ہے اب

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اٹھائیے
اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھائیے

بے لطف زندگی سے تو مرنا ہی خوب ہے
کیا فائدہ کہ نازِ مسیحا اٹھائیے

آؤ نہ آؤ ہم بھی ہیں خوگر شکیب کے
جی چاہتا ہے ذوقِ تمنا اٹھائیے

یاں بھی مژہ کو رخصتِ طوفانِ نوح ہے
ہاں بزم سے اٹھائیے اچھا اٹھائیے

دکھتے ہیں لوگ خلوتِ دشمن کا اہتمام
بے پردگی میں پردہ ہے پردہ اٹھائیے

بیٹھے ہیں ہم تو اب دلِ بے آرزو لیئے
وہ دن گئے کہ داغِ تمنّا اٹھائیے

ثاقب وہ ضبطِ اشک کو سمجھے ہیں بے معنی
یہ روئیے کہ شورشِ دریا اٹھلیئے

خبر کس کو ہو گرچہ گھائل ہوئے ہیں
محبت میں ہم جملہ تن دل ہوئے ہیں

تمنّا نہیں ہم کو پروانگی کی
وہ اب غیر کی شمعِ محفل ہوئے ہیں

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں
بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں

نہ لپٹیں نہ ہوں قتل انصاف یہ ہے
کہ ہم خود بہ آموزِ قاتل ہوئے ہیں

ہمیں ذوقِ صحرا نوردی ہے ثاقب
نہ سمجھو کہ جویائے منزل ہوئے ہیں

دل کا سودا ہے خفا ہونے کی کچھ بات نہیں
گفتگو رہتی ہے بائع کو خریدار کے ساتھ

دانہ پانی کی خبر لینے کی توفیق نہیں
کھیلنا جانتے ہیں مرغِ گرفتار کے ساتھ

چیر کر سینہ کو دل دیکھتے ہیں قتل کے بعد
اک چھری تیز لگی رہتی ہے تلوار کے ساتھ

خواہشِ وصل میں ثاقب کی کوئی دیکھے سیر
کچھ دعائیں بھی پڑھی جاتی ہیں اشعار کے ساتھ

لالے زباں کو کام میں کرتے وہ ہم سے بات
مجبور رہ گئے کہ سرے سے وہاں نہ تھا

رکھا ہے خوب ناقہ و محمل کے بیچ میں
اے چرخِ پیر کیا کوئی ساربان نہ تھا

سمجھے ہوئے تھے قبر کو ہم کنجِ عافیت
دیکھا تو یاں بھی امن و اماں کا مکاں نہ تھا

گرمی میں دل کو کھول کے بندِ قبا کہا
شکرِ خدا کہ ثاقبِ آشفتہ یاں نہ تھا

ہم قوتِ جذبۂ دل دکھائیں
اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا چیر کے سینۂ دل دکھائیں
کچھ حال سنو تو ہم سنائیں

آئے نہیں یاں اگر نہ آئیں
اے کاش مجھے وہیں بلائیں

اے بخت کہاں تلک برائی
اے چرخ کہاں تک جفائیں

ہم سینہ سپر کئے کھڑے ہیں — وہ شوق سے خنجر آزمائیں
جو کام ہیں غیر کی ہوئیں صرف — افسوس وہ دلربا ادائیں
شاید کہ ہے گرم نالۂ ثاقب — چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

ہر شخص کا دل شہر میں کھنچتا ہے اِدھر کو — پوچھے کوئی کیوں اور یہ رستہ ترے گھر کا
اس عصر میں کہتے تھے اسے پیاسی طوفان — بچپن کا ہے یہ نام مرے دیدۂ تر کا
کیوں وعدہ کروں لے خبر آجاؤ کسی وقت — ہوں وصل کا خواہاں نہیں مشتاق خبر کا

گھر بیاباں میں بنایا نہیں ہم نے لیکن — جس کو گھر سمجھے ہوئے تھے وہ بیاباں نکلا
دی جگہ دیر میں ثاقب کو سمجھ کر ہم کیش — وہ عدوئے بت و بتخانہ مسلماں نکلا

ڈرتے ہیں وہ جہاں نظر آتا ہے گردباد — سہمے ہوئے ہیں کیا مرے مشتِ غبار سے
رنجش سے گر کہا ہو تو ایماں نہ ہو نصیب — کافر بتوں کو کہتے ہیں عشّاق پیار سے

جرأت

آپ کا اصل نام یحیٰی اماں تھا۔ خلف حافظ امان۔ تخلص جرأت۔ مگر زمانے نے آپ کو قلندر بخش کے نام مشہور کر دیا۔ آپ کو میر جعفر علی حسرت سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ جب دہلی کی حالت خراب ہوئی آپ فیض آباد چلے آئے تھے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ انیس ۱۹ سال کی عمر میں چیچک کے عارضہ میں بینائی جاتی رہی۔ علم نجوم اور موسیقی میں کامل تھے ستار خوب بجاتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ بہادر اور نواب محمد خاں بہادر کی رفاقت میں تھے۔ مضامین معاملات عاشق و معشوق باندھتے تھے۔ اشعار عشقیہ ہوتے تھے۔ ۱۸۱۰ سنہ عیسوی میں وفات کی۔

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
بات ہی اوّل تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی — اور جو بولے ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

جا کے پھر آؤں نہ جاؤں اس گلی میں دوڑ دوڑ
پر کروں کیا میں نہیں پھرتا ہے دل آیا ہوا

جاؤں جاؤں کیا لگا یا ہے اجی بیٹھے رہو
ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اکتایا ہوا

کیا کہیں اب عشق کیا کیا ہم سے کرتا ہے سلوک
دل یہ بیتابی کا اک پتلہ ہے بہکلا یا ہوا

ہے قلق سے دل کی یہ حالت مری کہ اب تو میں
چار سو پھرتا ہوں اپنے گھر میں گھبرایا ہوا

اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

کیا بات کوئی اس بتِ عیار کی سمجھے
بولے ہے جو ہم سے تو اشارات کہیں اور

اس دہر میں پاؤں میں کہاں دخترِ رز کو
رہتی ہے مدام اب تو وہ بدذات کہیں اور

جس رنگ مری چشم سے برسے ہے بڑا خوں
اس رنگ کی دیکھی نہیں برسات کہیں اور

گھر اس کو بلا نذر کیا دل تو وہ جرأت
بولا کہ یہ بس کیجے مدارات کہیں اور

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے میں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاؤں یہ کرو کیا کہ وہیں
دل بے تاب لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

آج بھی اس کے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے

لوگ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
اپنے بیگانے ہیں سب اس بزم میں آئے ہوئے

دل میں بت کچھ سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں
کیا کہیں ان سے کہ ہیں ہم تو نکلوائے ہوئے

دم مارتے نہیں اور اٹھاتے ہیں ظلم یار
اپنا جو اک مزاج پڑا ہے نباہ کا

تیرے مریضِ غم کی زباں پر نہیں کچھ اور
اک تار بندھ گیا ہے فقط آہ آہ کا

نہ آنے کی جب میں سنانے لگا
وہ آئینہ مجھ کو دکھانے لگا

کسی نے جو پوچھا خفا کس سے ہو
اشارے سے مجھ کو بتانے لگا

یاد آتا ہے تو بس رو رو کے زالوں بیٹھنا اس کا ہنس دینا اور اپنا گڑگڑانا ران کا
پھر کہو، سوتے ہیں بوسہ کیوں لیا تو نے مرا گو ہے تہمت، پر مزہ ہے کیسا اس بہتان کا

ہوا جب بات کرنا ترک بالکل تو کیا اس بات کا چرچا نہ ہوگا
نہ کھو جرأتؔ کو اپنے ہاتھ سے تو کہ ایسا شخص پھر پیدا نہ ہوگا

آسیا سے کوئی اب سیکھے رفاقت کا طریق ساتھ گردش میں بھی پتھر کا نہ چھوٹے پتھر
سنگ بر سینہ ہوں کہنا یہ کسی کا کر یاد چھوڑ بس چھوڑ پڑیں تجھ پہ نکوڑے پتھر

دل میں آنا نہیں اس کے مرے گھر آنے کو تا یہ لوگوں میں کہے بات قسم کھانے کو
رات بولا وہ مرے نالۂ جاں سوز کو سُن آگ لگ جائیو جُرأتؔ ترے چلاّنے کو

گر چُرایا نہیں ہے تم نے دل مسکراتے کیوں ہو ادھر کو دیکھ کر
کھُل گیا اپنا جو لوشتہ تھا دور سے شکلِ نامہ بر کو دیکھ کر

روز غل آگ لگ اٹھنے کا واں رہتا ہے جس محلہ میں ترا سوختہ جاں رہتا ہے
اصل میں دیکھ کے رہتا ہوں یہ حیراں کہ وہ شوخ دم بدم جانبِ در کیوں نگراں رہتا ہے

رکھے نہ کیوں وہ ہم سے پردہ کہ ذاتِ باری حجاب میں ہے
یہ اس کا مکھڑا نہیں ہے گویا خدا کی قدرت نقاب میں ہے
نہ دیکھی گو آنکھ اٹھا کے اوپر غضب ہیں وہ نیچی نیچی نظریں
بری ہے چتون وہ اس کی کافر لاکھ شوخی حجاب میں ہے

قطعات

کل اس خونخوار کی محفل میں جوں ہی — دلِ بے تاب مجھ کو کھینچ لایا
تو اس نے یہ کہہ کر منھ پھیرا — کہ پھر بدنام کرنے والا آیا

بوقتِ نزع مجھ کو دیکھ ہمدم — یقیں وہ بدگماں نہ لایا
بسی ہے چور کے دل میں جو چوری — تو کہتا ہے کہ دم اس نے چرایا

رکھا قدم جو اس نے مری قبر پر آکر — اور سنگ سے تربت کے ہوئے تک کفِ پا گرم
تو کیا کہوں کس ناز سے جھنجلا کے بولا — اللہ قیامت ہے یہ اب تک ہے مو اگرم

اشعار متفرق

جنھوں کا نامہ پہونچتا ہے اس ستمگر تک — الٰہی کاکاش کہ جرأت نامہ بر ہوتا
کون دیکھے گا بھلا اس میں بھی ہے رسوائی کیا — خواب میں آنے کی بھی تم نے قسم کھائی ہے کیا
کیا کہیں وصل ہوئے پر بھی زباں سے اپنی — حرفِ مطلب نہ کوئی خوف کے مارے نکلا
یاد کیا آتا ہے میرا وہ لگے جانا کہ آہ — پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائے گا
گئے وہ دن سُناتے تھے جو شب کی داستانوں کو — ہم اپنے مہربانوں کو وہ اپنے رازدانوں کو
در تک اب چھوڑ دیا گھر سے نکل کر آنا — یا وہ راتوں کو بھی بھیس بدل کر آنا
میرے ہوتے غیر سے مختلط ہوتا ہے وہ — دیکھے اس دم کوئی رُکنا اور گھبرانا مرا
دید کا طالب ہوں تو سن کر کہے جرأت وہ شوخ — خاک دیکھے گا تری آنکھوں میں بینائی نہیں
سو خرابی سے جو ہم یار کے در تک پہونچے — وہ سُنی بات کہ پھر جیتے نہ گھر تک پہونچے

جلال

میر ضامن علی تخلص جلالؔ خلف حکیم اصغر علی خاں داستان گو۔ آپ ۱۸۳۴ء سنہ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کو شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا۔ کچھ دنوں تک امیر علی ہلالؔ (شاگرد رشکؔ) سے

مشقِ سخن کی۔ چونکہ قابلیت اور مناسبِ فطری تھی لہذا بہت جلد ترقی کر گئے اور جلال صاحب کے توسط سے جناب میر اوسط علی رشک کی شاگردی میں آگئے جب رشک صاحب کربلائے معلی تشریف لے گئے تو مرزا محمد رضا برق سے کلام پر اصلاح لینی شروع کردی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ رامپور چلے آئے۔ اس وقت آپ کی عمر بائیس ۲۲ سال کی تھی۔ آپ کے والد نواب یوسف علی خاں رام پور کی سرکار میں داستان گو تھے۔ آپ بھی وہیں ملازم ہوگئے۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں نے آپ کی بڑی قدر کی اور سو روپیہ ماہوار سرکار سے ملتا رہا۔ نواب کلب علی خاں کے بعد آپ لکھنؤ چلے آئے اور ایک مکان خرید کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی تصنیفات میں چار دیوان اور تین دوسری کتابیں شامل ہیں۔ ۱۳۲۴ھ میں سفر آخرت کیا۔

ہم تھوڑے سے جرم پہ بھی شرمائے ہیں کیا کیا
اک جرعۂ مے پی کے عرق آئے ہیں کیا کیا

شوریدہ سر آشفتہ سیہ بخت پریشاں
دیوانۂ گیسو نے لقب پائے ہیں کیا کیا

ہم حشر سے پھر کوچۂ محبوب میں آئے
جو رہ گئے جنت میں وہ پچھتائے ہیں کیا کیا

جب حد سے یہاں گذری ہے تر دامنی اپنی
دریا تری رحمت کے بھی لہرائے ہیں کیا کیا

اے توبہ لے آج خدا تیرا نگہباں
کیا ٹھنڈی ہوا چلتی ہے ابر آئے ہیں کیا کیا

کروٹ بھی نہ لی طالعِ خفتہ نے ہمارے
ناصح شبِ ہجر میں چلائے ہیں کیا کیا

پہونچے نہ وہاں تک یہ دعا مانگ رہا ہوں
قاصد کو ادھر بھیج کے دھیان آئے ہیں کیا کیا

لکھنے جو لگے یار کو ہم شوقِ ملاقات
پہلو دلِ بے تاب نے بتلائے ہیں کیا کیا

دیکھا ہے جلال اک بتِ خوش چشم کو جب سے
آنکھوں نے تماشے ہمیں دکھلائے ہیں کیا کیا

کام ارماں ترے وصل کا آیا کیا کیا
رات بھر روٹھے ہوئے دل کو منایا کیا کیا

سیکھے تم کتنی جفائیں تمہیں آیا کیا کیا
سچ کہو میری وفاؤں نے سکھایا کیا کیا

غیر کی یاد نے ملنے نہ دیا دیکھ لیا
تم نے دل اپنا مرے دل سے ملایا کیا کیا

پوچھتی حسرتِ دیدار جو گویا ہوتی — چشم و دل کو ترے جلوہ نے دکھایا کیا کیا
کیا لکھوں خط میں کسی کو مجھے کچھ یاد نہیں — دلِ مضطر نے خدا جانے بتایا کیا کیا
دل میں رہ کر ترے پیکان نے احساس کیا — گدگدا کر مرے زخموں کو ہنسایا کیا کیا
کہیں جاتے تھے یہ کہتے ہوئے شب کو جلالؔ — کسی کم بخت کے نالوں نے ستایا کیا کیا

جو دل نہ ہوگا نہ ہوا اس کا مجھ کو غم بھی نہیں — سُنا رہی ہے آرزو تیری کہ ہم بھی نہیں
تمہارے وعدہ کا کچھ اعتبار آیا تھا — غضب ہے آج وہ جھوٹی قسم بھی نہیں
جو مہرباں نہیں ہوتے وہ، اے فلک نہ سہی — ستم تو یہ ہے کہ ہم قابلِ ستم بھی نہیں
اجل کہاں ہے وہیں کوئے یار سے لے جاؤ — قریب گھر ہے تو ہو دور کچھ عدم بھی نہیں
کہا یہ ضعف نے جب منزلوں ہے کوئے یار — پکاری شوق کی ہمت، کہ دو قدم بھی نہیں
بُرائی کچھ تو کوئی برہمن کی بتلا دے — جنابِ شیخ کے مانند ہٹ دھرم بھی نہیں
یہ ہم سے حشر میں کہتی ہے حسرتِ دیدار — کہ وہ نہ آج دکھائی دئے تو ہم بھی نہیں
نشانِ عشق وہ ہنس ہنس کے پوچھتے ہیں جلالؔ — یہ جانتے ہیں مرے دل میں غم بھی نہیں

تیوری جو اس کی چڑھ گئی عاشق پہ آ بنی — بن کر ادا بنی تو بگڑ کر قضا بنی
ڈالے گی بل نگہ میں کہ ابروئے یار میں — کس کے بگاڑنے کو یہ زلفِ دوتا بنی
خلعت ملا تھا عشق کی سرکار سے جنوں — اس میں ہمارا جامہ گلوں کی قبا بنی
بدلا نہ وصل میں نگہِ شرمگیں کا رنگ — شوخی بھی اس کی آنکھوں میں آ کر حیا بنی
اندازِ بحث نے بھی کیا عاشقوں کو قتل — تقدیر کی کجی بڑی بانکی ادا بنی
اوّل تو بزمِ یار میں دخلِ حیا کہاں — اور آ گئی کبھی تو وہ خود بے وفا بنی
بگڑا رقیب ان سے وہ بگڑے رقیب سے — اس کی ذرا خبر نہیں کہ ہم پر جو آ بنی
برہم تو وہ ہوئے نہیں پڑھ کر خطِ جلالؔ — قاصد بتا بگڑ گئی تقدیر یا بنی

شوق اللہ رے اس چشم تماشائی کا
حوصلہ تنگ ہوا جاتا ہے بینائی کا
بے نشاں سنگِ در یار ہی کرتا تھا
دل یہ اک داغ ہے کمبخت جبیں سائی کا
آنکھ میں چھپنے کو تو آتی تھی اے حسرتِ دید
کیا خبر تجھ کو تھی گھر ہے یہ رسوائی کا
رُخ کرے جو ہر فلک خلق کی جانب کیونکر
پھرتے دیکھا نہیں منھ تیرے تماشائی کا
جلوہ جب اس کا نہ دیکھا تو دکھایا مجھ کو
روزِ محشر نے بھی عالم شبِ تنہائی کا
سایہ تک اپنا کسی کو نہ دکھایا تو نے
رکھ لیا شرم نے پردہ تری یکتائی کا
آپ کو بھول گئے دیکھ کے اس بت کو جلال
حق ادا ہو نہ سکا پھر بھی شناسائی کا

یکار اٹھتا ہے جلوہ اس کی شانِ کبریائی کا
وہ بت ہوں کہ زیبا ہے جسے دعویٰ خدائی کا
جمالِ یار عکس افگن نہیں کسی آئینہ رو میں
یہ روپوشی کی عادت پھر پڑیگا خودنمائی کا
دکھا دیتا جو نرگس آنکھ رکھتی میری سی
چمن ہے اک نمونہ یار کی رنگیں ادائی کا
ہزار احسان ہیں تیرے کہ دردِ عشق اک پیکر
مزہ دل میں ہمارے بھر دیا ساری خدائی کا

کیا اس کا گلہ، کوچۂ دلبر نہیں ملتا
خود گم یہ ہیں کہ اپنا بھی ہمیں گھر نہیں ملتا
امید نہیں حشر میں بھی ملنے کی اس سے
ہم ڈھونڈتے ہیں عرصۂ محشر نہیں ملتا
بیگانہ ہو جب سب سے تو ہوتا ہے وہ اپنا
ملنے کی طرح ملئے تو کیوں کر نہیں ملتا

جوش

نام شاہ خلیل الدین احمد عملۂ سررشتہ رجسٹری ضلع مونگیر۔ تخلص جوش، خلف مولوی شاہ محمد اصغر باشندہ بنیر ضلع پٹنہ. شاگرد عبدالغفور نساخ. فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

کہیں دشمن سے نہ بگڑی ہوئے
رات کو کس لئے وہ گھر نہ گیا
نہ گیا زیرِ زمیں کون سا اشک
کونسا نالہ فلک پر نہ گیا
کیوں سلیقہ سے نہ کاٹی گردن
خون میں ہاتھ تیرا بھر نہ گیا

ہائے اس کی وہ نظر جانبِ در ‏ ‏ رات بیمار تیرا مر نہ گیا

حوروں کا دلا رہا ہے شوق ‏ ‏ واعظ کچھ عجیب آدمی ہے
امیدِ وصلِ یار اور ہیں ‏ ‏ ایسی تقدیر کب مری ہے
خوبوں میں نہیں ہے آدمیت ‏ ‏ ہے حور کوئی کوئی پری ہے
تھا عالمِ جبر کیا بتائیں ‏ ‏ کس طرح سے زیست ہم نے کی ہے

عدو سے آپ کی نبھتی ہے کب تک ‏ ‏ یہی ہم کو بھی تو اب دیکھنا ہے
یہ کہیئے گا کہیں جاتے نہیں ہم ‏ ‏ ذرا دیکھو تو کس کا نقش پا ہے
مرا خط لا کے دے قاصد عدو کو ‏ ‏ یہی تقدیر کا مری لکھا ہے
عدو اور تم بھلے ہو اور برا جوشؔ ‏ ‏ جو کچھ فرمایئے صاحب بجا ہے

قتل میں دیکھ لے جو مری بے بسی کا حال ‏ ‏ بھر آئے جوہر شمشیر میں سرشک
دل کو بہایا آنکھوں کو بے نور کر دیا ‏ ‏ اے جوشؔ اب ہے جان کی تدبیر میں سرشک

زہے قسمت زہے طالع زہے بخت ‏ ‏ کہ آیا وقت پر اسے یار تو آج
ہے بزمِ یار میں دشمن بھی میں بھی ‏ ‏ کئے دیتا ہوں قصہ ایک سو آج

کس لئے میری نمازوں پہ ہنسا کرتے ہیں ‏ ‏ نہ سہی گر نہیں ملتی مجھے حور آپ کو کیا
لن ترانی کی لیں جوشؔ سے کچھ یاد بھی ہے ‏ ‏ اس نے دیکھا نہیں پردے میں حضور آپ کو کیا

اشعار متفرق

یہیں رہ جایئں ہمی غیر سہی ‏ ‏ آپ کیوں غیر کے گھر جائیگا
ساری دُنیا سے بے خبر پایا ‏ ‏ جس کو عالم میں بے خبر دیکھا

لوگ کہتے ہیں شدّتِ غم سے
جوشِ بے چارہ آج مر ہی گیا

غمِ دلدار ہے یا رشکِ عدو
اور کیا اس کے سوا ہے دل کو

کرتا ہے تو ذکرِ یار و دشمن
ناصح یہ دوستی تو نہیں ہے

کچھ درد ہیں کچھ کہی ہے روتے
ناسور کی طرح زندگی کی

حاتمؔ

نام ظہور الدین عرف شاہ حاتمؔ ولد فتح دین۔ آپ شاہجہاں آباد (دہلی) کے رہنے والے تھے۔ آپ مضمونؔ، ناجیؔ اور آبروؔ کے ہم عصر تھے۔ آپ کا سن ولادت سنہ ۱۷۰۰ء اور وفات سنہ ۱۷۹۶ء۔ آپ نے ابتدا میں پیشہ سپہ گری اختیار کیا اور نواب امیر محمد خاں شاہی کی سرکار میں ملازمت اختیار کر لی۔ بعد میں ایک آزاد منش فقیر کی زندگی بسر کی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلے رمزؔ تخلص اختیار کیا اور بعد میں حاتمؔ۔ آپ کے شاگردوں میں سوداؔ۔ سعادت یار خاں رنگینؔ اور لالہ بالمکند رائے فارغ جیسے اُستاد شاعر ہوئے ہیں۔ آپ نے قصائد۔ رباعیات اور غزلیات میں خوب طبع آزمائی کی ہے آپ کی وفات ۹۶ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور دہلی دروازہ کے باہر دفن ہوئے۔ آپ کا بڑا کلیات جو اکثر قدیم غزلیات۔ قصائد اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ آپ کی حیات میں ہی شائع ہو چکا تھا۔

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

شیریں لبا سوں سنگ دلوں کو اثر نہیں
فرہاد کام کوہ کنی کا کیا تو کیا

جلنا لگن میں شمع صفت سخت کام ہے
پروانہ جوں شتاب عبث جی دیا تو کیا

ناسور کی صفت ہے نہ ہو گا کبھی وہ بند
جرّاح زخم عشق کا اگر سیا تو کیا

محتاجگی سوں مجھ کو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتمؔ کیا تو کیا

خال اس کے نے دل لیا میرا
تل میں اس نے لہو پیا میرا

جانِ بے درد کو ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا

اس کے کوچہ میں مجھ کو پھرتا دیکھ — رشک کھاتی ہے آسیا میرا
نہیں شمع و چراغ کی حاجت — دل ہے مجھ بزم کا دیا میرا
زندگی دردِ سر ہوئی حاتم — کب ملے گا مجھے پیا میرا

کاملوں کا یہ سخن مدت سوں مجکو یاد ہے — جگ میں بے محبوب جینا زندگی برباد ہے
بندگی سوں سرو قد کی اک قدم باہر نہیں — سرو گلشن بیچ کہتے ہیں مگر آزاد ہے
بے مدد زلفوں کی اس کے حسن نے قیدی کیا — صید دل بے دام کرنا صنعت استاد ہے
خلق کہتی ہے بڑا اتھا عاشقی میں کوہکن — تجھ لبِ شیریں کی حسرت میں ہر اک فرہاد ہے
دل نہاں پھرتا ہے حاتم کا نجف اشرف کے بیچ — گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے

سرو کچھ دعویٰ کرے گر قامتِ دلبر سے آج — چیر ڈالے فاختہ آرہ بنا شہپر سے آج
خال دانہ، زلفِ دام، ابرو کماں، مژگاں ہے تیر — دل ہمارا سہم اب کھاتا ہے کار ابتر سے آج
زلف و چشم و خال و خط چاروں ہیں دشمن دین کے — حق رکھے ایماں سلامت ایسے کفر و شر سے آج
ہاتھ مت کھینچ اے جنوں تجکو مرے سر کی قسم — ایک جیب تک بھی رہے تارِ گریباں سر سے آج
رات دن جاری ہے عالم میں مرا فیضِ سخن — گو کہ ہوں محتاج پر حاتم ہوں اس جوہر سے آج

جدا نہیں سب ستی تحقیق کر دیکھ — ملا ہے سب سے اور سب سے ہے نیارا
مسافر اُٹھ تجھے چلنا ہے منزل — بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا
مثالِ بحر موجیں مارتا ہے — کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا
سیانے خلق سے یوں بھاگتے ہیں — کہ جوں آتش سیتی بھاگے ہے پارا
سمجھ کر دیکھ سب جگ سیکھ ماہی — کہاں ہے، سکندر کہاں ہے دارا
کہے ہیں اہلِ عرفاں اس کو جینا — جو مر کر عشق میں دنیا سوں ہارا
صفا کر دل کے آئینہ کو حاتم — دکھا چاہیے سخن گر آشکارا

چھپا نہیں جا بجا حاضر ہے پیارا — کہاں وہ چشم جو مارے نظارا
یہاں طالعوں سے ملتا ہے پیارا — عبث دیکھے ہے زاہد استخارا
میں پایا ہوں ولے تجھ چشم کا بھید — نہ مانگوں کبھی ان کا اشارا
کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے — کرے کیا ایکلا حاتم بچارا

تم تو بیٹھے ہوئے یہ آفت ہو — اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
مفلسی اور دماغ اے حاتم — کیا قیامت کرے جو دولت ہو

اے خردمندوں مبارک ہو تمہیں فرزانگی — ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی
بے مروت بے وفا بے دید اے ناآشنا — آشناؤں سے نہ کر بے رحمی اور بیگانگی

اشعار متفرق

لب تمہارے سرخ ہم نے دیکھ کر پوچھا تھا (ل) — جوہری کہنے لگے یہ مال ہے گا بے بہا
مردماں کو دیکھ کر بسمل ترے کوچہ کے بیچ — ڈر گیا اور چشم سے آنسو کی جا ہے خوں بہا
اس قدر کی صرف تسخیر پریرویاں میں عمر — رفتہ رفتہ نام میرا اب پری خاں ہو گیا
ترے چشم کے گوشے میں تل ہے اے پیارے — نظر پڑا ہے کہیں خال خال آنکھوں میں
آتا ہے اب نشہ کی طرف جی کبھو کبھو — ساقی نگاہ مست ادھر بھی کبھو کبھو
کریں ہیں قمریاں تعریف سرو اور ہم ترے قد کی — جو تو آئے چمن میں تو ہمارا بول بالا ہو
دیکھ جراح تیرے مرہم کو — میرے سینہ کا داغ ہنستا ہے
بے خود اس دور میں ہیں سب حاتم — ان دنوں کیا شراب سستی ہے
پیری میں آج مرا یار ہم کنار ہے — ساقی شراب لا کہ خزاں میں بہار ہے
سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے — ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے
ہر صبح آٹھ بتوں سے مجھے رام رام ہے — زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

حالیؔ

نام خواجہ الطاف حسین تخلص حالیؔ۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ ابتدائی فارسی تعلیم سید جعفر علی سے اور عربی کی تعلیم حاجی محمد ابراہیم سے حاصل کی۔ منطق اور فلسفہ کی تکمیل دہلی میں کی تکمیل علوم کے بعد آپ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے بچوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ طبیعت کا رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا۔ لہٰذا آپ نے مرزا غالبؔ کی شاگردی اختیار کرلی۔ ۱۸۵۷ء میں آپ پنجاب بک ڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے اور وہاں کے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ پنجاب بک ڈپو لاہور میں ۱۵ سال ملازمت کرنے کے بعد اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء میں آپ علی گڑھ ڈپیوٹیشن میں حیدر آباد گئے۔ اس کے بعد آپ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۴ء میں وفات کی۔

رباعیات

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے نہ بن آیا تیرا

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

نکالو نہ رخنے کسی کے نسب میں
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبّت زیادہ

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دُھرپت زیادہ

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اس کو مٹا کے چھوڑا

فرہادِ کوہکن کی لی تو نے جانِ شیریں
اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوب سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسف سے پارسا پر بہتان لگا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دل کش
شعر و سخن کا تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کو
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں، جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

ہم نے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار
بات یہ جچتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

قطعہ - نوحۂ دہلی

تذکرۂ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سُنانا ہم کو
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رولانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب / درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی / کوئی دلچسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ بہت اے سیّاح / دیکھو اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

ہر قدم پر ہیں یہاں گوہرِ یکتا تہِ خاک / دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر / اب نہ دیکھوگے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی / یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

نظم۔ حبِّ وطن (چند اشعار)

ہے کوئی قوم کا اپنی ہمدرد / نوعِ انساں میں جسکو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح / جس کو حیوان پہ دے سکیں ترجیح

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے / قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے

سمجھے ان کی خوشی کو راحتِ جاں / واں جو نوروز ہو تو عید یہاں

جب پڑے ان پہ گردشِ افلاک / اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

بیٹھے بے فکر کیا ہم وطنو / اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ / ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

اک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر / ہے ان میں کوئی خشک کوئی تر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو / لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر / نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو / بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہوئے یا کہ ہو حنفی / جین مت ہوئے یا ہوئے وشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو / سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ہند میں اتفاق ہوتا اگر / کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی / اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے / ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی اس نے ہے قتل عام کیا | کبھی اس نے آ غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی | ایک شائستہ قوم مغرب کی
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے | چین کس کو ملا ہے غیروں سے

حجّام

نام عنایت اللہ عرف کلّو تخلص حجّام متوطن سہارنپور۔ مقیم دہلی پیشہ مُوتراشی شاگرد مرزا محمد رفیع سوداؔ۔ آپ کی تمام عمر دہلی میں گزری۔ آپ اکثر اپنے شعروں میں اپنے پیشہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مصحفی کا قول تھا کہ اچھا شعر کہتے ہیں۔ خیالات بال سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں۔ آپ کا کلام بہت کم ملتا ہے۔ ۱۷۵۰ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

ہے جی میں اک روز میں ان آنکھوں سے پوچھوں | بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمہارے
اس کاوشِ مژگاں کا گلہ مجھ سے عبث ہے | یہ آنکھوں پہ بوئے ہوئے ہیں خار تمہارے
اس شوخ کے کوچہ میں نہ جایا کرو حجّام | چھن جائیں گے اک روز یہ اوزار تمہارے

اشعار متفرق

روز رخسار کے لیتا ہوں مزے خوبوں کے | بہتر اس شغل سے حجّام ہُنر کیا ہوگا
جینا نظر اپنا تو ستمگر نہیں آتا | بے وصل ترے سو یہ میسّر نہیں آتا
خط آنے سے بھی اپنی رسائی نہیں ہے واں | حجّام کس طرح سے ملیں کیا ہُنر کریں
رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی | بلا حجّام کو جس روز تم حمام کرتے ہو
آنکھوں کو اس کی شاعر جب دم غزال باندھے | پھر ایسے وحشیوں کو کس کی مجال باندھے
کل میاں حجّام سب کا مونڈتے پھرتے تھے سر | آج اس کوچہ میں ان کی بھی حجامت ہو گئی
کیا مجکو ستاتی ہے تو اے گردشِ دوراں | میں نائی کا بیٹا ہوں کہیں سر نہ رگڑ دوں
لگ چلئے جو اس شوخ سے رستہ میں تو وائے | جھنجھلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رذالے

حسرت

نام مرزا جعفر علی۔ تخلص حسرتؔ ولد ابوالخیر عطّار باشندہ دہلی مقیم لکھنؤ۔ شاگرد جناب سروپ سنگھ دیوانہؔ۔ حسرتؔ صاحب جراتؔ لکھنوی کے استاد تھے۔

آخری ایام میں ترکِ دنیا کر کے گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا اصلی پیشہ عطاری تھا۔ مرزا محمد رفیع سودا نے آپ کی شان میں ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے۔ بہدانہ کا آندھی سے اڑا ڈھیر ہوا پر
ہر مرغ اسے کھا کے ہوا سیر ہوا پر

کل جو پہونچی تری آواز مرے کان کے بیچ — آ گئی سنتے ہی بس جان مری جان کے بیچ
سخت ہے خوف مجھے دل کا خدا خیر کرے — آگ بھڑکے ہے اسی سینۂ سوزان کے بیچ
یاں تلک روئے ترے غم میں کہ روتے روتے — نام غم کا نہ رہا دیدۂ گریان کے بیچ
ساربان محملِ لیلیٰ کو ادھر ٹک لے چل — خاک مجنوں کی بھٹکتی ہے بیابان کے بیچ
رو رو کے اک شاخ پہ بیٹھی ہوئی بلبلِ زار ق — حسرت اس شعر کو پڑھتی تھی گلستاں کے بیچ
وائے اے فصلِ خزاں سیر نہ دیکھا گل کو — اور ہی رنگ ہوا باغ کا اک آن کے بیچ

جگر سوزاں ہے دل بیتاب ہے اور چشم گریاں ہے — الٰہی دن ہے میرے مرگ کا یا شام ہجراں ہے
جو ایسا ہے دلِ دیوانہ میرے در پئے یاں ہے — تو پھر اک روز میرا ہاتھ اور اس کا گریباں ہے
اگر چشم حقیقت کو ذرا تو کھول کر دیکھے — تو اے یعقوب ہر اک مصر میں سو ماہِ کنعاں ہے
بھلا پھر کس سے الفت کیجئے اور کس کو دل دیجے — جسے ہم دوست سمجھے ہیں وہ اپنا دشمن جاں ہے
برنگِ شمع دل جلتا ہے تربت پر مری سو بھی — چراغ صبح کے مانند کوئی دم کا مہماں ہے
یہ کس کی لاش جاتی ہے کہ جس کے ساتھ اے گردوں — غم و درد و الم فریاد و افغاں مرثیہ خواں ہے

جو حسن و ادا چاہیئے سو تجھ میں ہے سب کچھ — پر چھاتی پر انگیا میں ہے یہ چیز عجب کچھ
گو گوٹے کناری میں تو بجلی کی چمک ہے — لیکن وہ تمامی کی کٹوری ہے غضب کچھ
مکھڑے کی صفا جوڑے کی بندش سو کہوں کیا — دل کچھ ہے تیری آن و ادا ہے تیری شب کچھ
ہے دامِ بلا دل کے لئے جالی کی کرتی — گوٹے لگے نیفے نے رکھا ہوش نہ اب کچھ
وہ بندِ ازار اب جو جھلا جھل کا پڑا ہے — اس عقدہ کے کھلنے کا کسے یاد ہے ڈھب کچھ

چولی مسکی بند ہیں لوٹے سر کے بال پریشاں ہیں
اس بگڑے عالم پر تیرے لاکھ بناوٹ قرباں ہیں
کپڑے بدن کے ملے دلے ہیں بلکہ بدن سب ملا دلا
شب کے باسی پھولوں کا عالم کس سے کہیں ہم حیراں ہیں
مُنھ اُترا ہے گال ہے نیلا پلکیں جھلکیں آنکھوں میں خمار
نام خدا بگڑے عالم پر جمع ادائیں پنہاں ہیں
سچ کہو حسرت پاس رہے تھے رات بنا جس سے یہ رنگ
اس کمبخت کی صحبت سے بیزار جہاں کے خوباں ہیں

جو قول و قرار تھے آپس میں وہ دونوں طرف موقوف ہوئے
تم اور کہیں مالوف ہوئے ہم اور کہیں مصروف ہوئے
اب قسمیں کھانے سے کیا حاصل جو تم نے ڈھنگ نکالے ہیں
سو خوب طرح سے عالم میں مشہور ہوئے معروف ہوئے
ہاں صاحب سب کو دنیا میں خوش آتی ہے بہبود اپنی
تب ایک ہی سے تھے بدنام اب لاکھ صفت موصوف ہوئے

بوٹے سے قد میں تو ہے عجب دلبری کی شکل
اور نکھرا دیکھئے تو ہے سچ مچ پری کی شکل
رخسار دیکھئے تو وہ ہیں مہر و ماہ سے
ہیچک کا داغ ہے تو وہ ہے مشتری کی شکل
جوڑا باندھنے میں ادا بند بے مثال
زلفوں کے کھولنے میں ستم گستری کی شکل

گر کہے تو رات تو دن کو کہوں میں رات ہے
کفر اس میں کچھ نہیں یہ دل ملنے کی بات ہے
چھپکے جو بیٹھے ہو تم ملنا سبھوں کا ترک کر
جانتا ہوں میں کہ دل لینے کی یہ بھی گھات ہے

اشعار متفرق

گیا دل سو گیا رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا
اگر رو رو کے جی کھو دیں تو پیدا دل نہیں ہوتا

زخم تیر نگہہ و خنجر برآں اٹھا
پر دل زار تو مرہم کا نہ احسان اٹھا

درس تھا مکتب میں مجھ کو آہ کا
یہ سبق تھا پہلی بسم اللہ کا

فرقہ کوئی بچا نہیں اس ترک چشم سے
مارے بہت پڑے ہیں مسلماں علی الخصوص

ہوا سے بال ان زلفوں کے رخسار و پہ ہلتے ہیں
دل بیمار اٹھ بیٹھو کہ دونوں وقت ملتے ہیں

ساقی مے دے کہ اہل مجلس
پانی پانی پکارتے ہیں

برنگ آبلہ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے
کہ جس کے پاؤں پڑتا ہوں اسی کو سرگرانی ہے

بزم میں بیٹھے تھے کل جتنے پری رو حور سے
دیکھ کر اس کو لگے لینے بلائیں دور سے

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو دل ہم تمہیں دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے شکل آ کے دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سے جگا گئے

مجھ کو تجھ سے خدا جدا نہ کرے
میں ہوں تجھ سے جدا خدا نہ کرے

حسن

نام میر غلام حسن متخلص حسن معروف میر حسن خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک شاگرد جناب ضیا الدین۔ آپ ۱۷۳۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں والد کے ساتھ فیض آباد آ گئے۔ مدتوں وہاں رہنے کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ شاعری میں آپ نے خوب نام پیدا کیا اور بہت سی ادبی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۷۸۶ء میں عدم کی راہ لی۔

گر عشق سے کچھ مجکو سروکار نہ ہوتا
تو خواب عدم سے کبھی بیدار نہ ہوتا

دنیا میں تو دیکھا نہ سوائے غم و اندوہ
میں کاش کہ اس بزم میں ہشیار نہ ہوتا

کرتا میں حسن قدس کے عالم ہی میں پرواز
ہستی کا اگر اپنی گرفتار نہ ہوتا

جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سے سر گذر جانا
مزہ ہے استقامت میں مثال شمع مر جانا

نکل اے جان اب دل سے کہ صاحب خانہ آتا ہے — ترا تو جی ہی اٹھنے کو نہیں کیا یہ بھی گھر جانا
کوئی دم کے ہیں مہماں اس چمن میں ایک دم آخر — مثالِ نکہتِ گل شام جانا یا سحر جانا

سربستہ رہا یونہی یہ رازِ حرم و دیر — معلوم ہوا بھید نہ یاں کا نہ وہاں کا
بیگانہ ہے یاں کون اور اپنا ہے یہاں کون — ہے یہ سب بکھیڑا امرِ وہم و گماں کا
مرضی ہو جہاں اس کی وہی جا ہمیں بہتر — مشتاق دل اپنا نہیں کچھ باغِ جناں کا

غیر کو تم آنکھ بھر دیکھو — کیا غضب کرتے ہو اِدھر دیکھو
زلف و رخ دیکھنے سے تم کو ہے کام — شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

شادی اور بارات کا سماں

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہِ شب فروز
محل سے نکل کر جب ہوا سوار — بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا — کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
سپر اور قبضہ کھڑکنے لگے — سواروں کے گھوڑے پھڑکنے لگے
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے — پتنگے خوشی سے غزلخواں ہوئے
براتی اِدھر اور اُدھر جوق جوق — وہ آوازِ سرنا وہ آوازِ بوق
وہ دستہ برابر برابر وہ تخت — کسی پر کنول اور کسی پر درخت
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار — لہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات — کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات
بلوریں دھرے شمعداں بے شمار — چڑھیں بتیاں موم کی چار چار
وہ دولہا کا مسند پہ جا بیٹھنا — برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا
وہ سب ہو چکے جب رسم و رسوم — سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم
سحر کا وہ ہونا وہ ٹونے کا وقت — وہ دلہن کی رخصت وہ رونے کا وقت

وہ دلہن کا رو رو کے ہونا جُدا — وہ ماں باپ کا اور رونا جُدا
نکلتے وہ جانا محل سے جہیز — کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز

اشعار متفرق

خاموش ہی رہا وہ ہر گز حسن نہ بولا — جس کو مزہ پڑا کچھ اس لب کی گفتگو کا
اظہارِ خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
حسن بھی آدمی ہے کچھ خفا ہوتے ہو جس سے — خراباتی۔ جنونی۔ باولا۔ سودائی۔ آوارا
خار سے پھوٹے پھپولے پاؤں کے — درد ہی آخر مرا درماں ہوا
کہا میں کہ بھرتا ہوں دم آپ کا — لگا کہنے، صاحب کرم آپ کا
کیسی وفا کہاں کی محبت کدھر کی مہر — واقف ہی تو نہیں ہے کہ ہوتا ہے پیار کیا
پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
وصل ہوتا ہے جن کو دُنیا میں — یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں
غیروں کی بات کیا کہوں اسکی تو یاد میں — اپنا بھی مجکو دھیان کبھی ہے کبھی نہیں
سینکڑوں عالم دکھاتی ہے حسن دلبر کیساتھ — ٹھنڈی ٹھنڈی یاد اور پچھلے پہر کی چاندنی
اس ڈر سے اس کی زلف کی میں نے بات کی — جاتی ہے دور تک آواز رات کی
میں نے تو بھر نظر تجھے دیکھا نہیں ابھی — رکھیو حساب میں نہ ملاقات آج کی
اک جان کے درپے ہیں مرے اتنے ستمگر — غمزہ ہے کرشمہ ہے اشارا ہے ادا ہے
کیوں میں اس طرح رات دن روؤں — تو کسی سے اگر ہنسا نہ کرے
بیٹھی ہے کیا بنی یاں خسرو کیساتھ شیریں — بگڑی ہے بے طرح واں تیشہ سے کوہکن کی

خلیل

نام میر دوست علی تخلص خلیل۔ خلف سید جمال علی۔ باشندہ قصبہ بڈولی شاگرد حضرت آتش۔ آپ زیادہ تر لکھنؤ میں رہتے تھے ۱۸۶۲ء میں آپ کلکتہ بھی گئے تھے۔

ضعف سے کانپتے ہیں چلنے میں ہر بار قدم — پڑتے ہیں صورتِ چوبِ کفِ بیمار قدم
پائے رنگیں سے جو ہر نقشِ قدم ہے گلِ تر — چار باغ آئے نظر تم جو چلو چار قدم

سالکِ راہِ محبّت کو ہے غفلت سے ضرر
دیکھ لو سونے سے ہو جاتے ہیں بیکار قدم

مرتبہ خاک نشینوں کا جو سمجھے کوئی۔
رکھے پھر نقشِ قدم پر بھی نہ زنہار قدم

بے سبب دشتِ جنوں میں نہیں سرگرداں ہم
قلم آسا نہیں رکھتے کبھی بیکار قدم

حشر برپا ہو کہیں لوگ قیامت آئی
ربع سکوں میں ہو ہل چل جو چلو چار قدم

جلوۂ حسنِ رُخِ یار نے بے ہوش کیا
وصل میں لطفِ شبِ وصل میسّر نہ ہوا

دل ہے خود مرشدِ کامل اسے کیا سمجھاؤں
خضر کا کوئی کسی راہ میں رہبر نہ ہو

غمِ فرقت یہ بلا ہے کہ تمام اعضا میں
پھوٹ پڑ جاتی ہے جس وقت وہ دلبر نہ ہو

عشق نے دشمنِ راحت یہ بنایا ہے مجھے
نہ دیا دل اسے جو شوخ ستمگر نہ ہو

کڑیاں حسین بند کی پھندے ہیں جال کے
کھیلے گا مرغِ رنگِ حنا کا شکار ہاتھ

اس بُت کو دیکھتے ہی ہوا دل اسیرِ عشق
پتھر کے نیچے دب گئے بے اختیار ہاتھ

ہر طرح مل رہے گا پسِ مرگ اے خلیل
دس گز کفن گزی کا زمیں دو چار ہاتھ

حالت صفتِ شمع ہے یہ سوزِ جگر کی
پاؤں کو جلا دیتی ہے آتش مرے سر کی

میں مر گیا وہ گھر کو گیا صبح شبِ وصل
نقّارہ مرے کوچ کا نوبت تھی سحر کی

مر کر بھی چھپاؤں جو تری زلف کا سودا
بتّی نہ دھواں دے مری تربت پہ اگر کی

اچھے نہیں ہیں جوششِ وحشت کے رنگ ڈھنگ
تیور کچھ اب کے سال بُرے ہیں بہار کے

دم سے ہے طلسم آدمِ خاکی کا اے خلیل
پھرتی ہیں پتلیاں یہ سہارے سے تار کے

میرے دل میں اگر آپ آئیے گا
داغ کی طرح سے رہ جائیے گا

ہاتھ جوڑوں بھی تو ٹھہریں گے نہ آپ
ہنس کی طرح چلے جائیے گا

بتوں کا سبزۂ خط خال کا نہیں محتاج　　بغیر مُہر یہ خط اعتبار رکھتا ہے

ترقیوں میں تنزّل کا بھی خیال ہے شرط　　گڑھے کنوئیں کو نظر میں سوار رکھتا ہے

اشعار متفرق

رونے پہ باندھے ہے جو میری چشمِ تر کمر　　کیسے زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر

جانِ جاں عاشقوں میں نام جُدائی کا نہ لو　　موت کا ذکر نہیں کرتے ہیں بیماروں میں

تم سُنو یا نہ سُنو نالے کیئے جاؤں گا　　درد کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو

داغ

نام مرزا خاں تخلص داغ۔ آپ نواب شمس الدین خاں خلف نواب احمد خان کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ آپ کی والدہ اس کے بعد مرزا فخرو خلف بہادر شاہ ظفر کے گھر بیٹھ گئیں اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ آپ بھی ماں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گئے وہیں آپ کی تعلیم و تربیت عمل میں آئی۔ محل میں چونکہ شعر و سخن کی گرم بازاری تھی لہٰذا آپ بھی استاد ذوق سے مشقِ سخن کرنے لگے ۱۸۵۷ء میں فخرو صاحب کی وفات ہو گئی اور اسی زمانہ میں غدر کا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ یہ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد آپ رام پور چلے گئے۔ اور نواب یوسف خاں کے دربار میں رہنے لگے۔ نواب صاحب کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خاں نے آپ کی سرپرستی کی۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد آپ حیدر آباد چلے آئے۔ ابتدا میں آپ کی تنخواہ چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی۔ اس کے بعد آپ کا ایک ہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا اور آپ کو بہت سے خطابات یعنی بلبلِ ہندوستان، جہاں استاد۔ دبیر الدولہ اور فصیح الملک وغیرہ عطا فرمائے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد میں ہی انتقال کیا۔

رُباعیات

بے فائدہ انسان کا گھبرانا ہے　　ہر طرح اُسے رزق تو پہونچانا ہے

قارون کے خزانے سے بھی مل جائے گا　　منظور اگر اسے دِلوانا ہے

دریا کو اگر گوہرِ خوش آب دیا
گردوں کو اگر مہرِ جہاں تاب دیا
اے داغؔ یہ ان کا تھا یہ تیرا حصّہ
اللہ نے حاکم مجھے نواب دیا

بے مہری بے مہر سے دل سرد ہوا
جو حوصلہ تھا پست وہ گرد ہوا
جو صاحبِ درد ہو کرے داغؔ کی قدر
بے داغ ہوا کوئی تو بے درد ہوا

جنسِ دل آپ کو کیا مہنگی ہے یا سستی ہے
ہم نہیں بیچتے کچھ زور زبردستی ہے
اے فلک چین سے دم بھر تو پڑا رہنے دے
ہم بھی بستے ہیں جہاں خلق خدا بستی ہے
کوئی دم موت کا کھٹکا نہیں جاتا دل سے
نیستی کہتے ہیں جس کو وہ یہی ہستی ہے
اس دل کے سو ٹکڑے اڑے تن کو خبر تک نہ ہوئی
چشمِ بد دور یہ قاتل کی سبک دستی ہے
حیدرآباد رہے تا بہ قیامت قائم
یہی اب داغؔ مسلمانوں کی بستی ہے

آپ جن کو ہدفِ تیرِ نظر کرتے ہیں
رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں
غیر کے سامنے یوں ہوتے ہیں شکوے مجھ سے
دیکھتے ہیں وہ اُدھر بات اِدھر کرتے ہیں
تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے
کیا بُرا حال فرشتوں کا بشر کرتے ہیں
ایک تو نشۂ مے اس پہ نشیلی آنکھیں
ہوش اڑتے ہیں جدھر کو وہ نظر کرتے ہیں
حضرتِ داغؔ کو دِلّی کی ہوا خوب لگی
رات دن عیش ہے جلسوں میں بسر کرتے ہیں

دم نہیں دل نہیں دماغ نہیں
کوئی دیکھے تو اب وہ داغؔ نہیں
ایسے ویرانے میں کیوں آئیں
خانۂ دل ہے خانۂ باغ نہیں
بات کرنی تو بار ہے تم کو
بات سننے کا بھی دماغ نہیں
کھوج ملتا ہے ہر حاضر کا
عمرِ رفتہ کا کچھ سراغ نہیں
داغ کو کیوں مٹائے دیتے ہو
دل سے ہو دور یہ وہ داغؔ نہیں

ساقیا دے بھی مئے روح فزا تھوڑی سی | بے وفا عمر کرے اور وفا تھوڑی سی
ہم تو اس آنکھ کے ہیں دیکھنے والے دیکھو | جس میں شوخی ہے بہت اور حیا تھوڑی سی
وعدہ غیر پہ کیا ہوتی ہے جلدی ان کو | ہاتھ دھو ڈالتے ہیں مَل کے حنا تھوڑی سی
ابھی بتخانے کے سجدے سے تو فرصت ہو لے | جا کے مسجد میں بھی کر لیں گے ادا تھوڑی سی
داغ یہ مے ہے یہ ساغر ہے کہاں کی توبہ | پی خدا کے لئے اے مردِ خدا تھوڑی سی

اے وعدہ فراموش رہی تجھ کو جفا یاد | یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد
وہ سنتے ہیں کب دل سے مری رام کہانی | فرماتے ہیں کچھ اور بھی ہے اس کے سوا یاد
سنتا ہوں رقیبوں سے بڑا معرکہ گذرا | اس وقت مجھے بھول کے تم نے نہ کیا یاد
معشوق سے اے داغ تغافل کا گلہ کیا | کیوں یاد کرے تجکو کرے اس کی بلا یاد

اے فلک موردِ عتاب ہوں میں | وصل سے خاک کامیاب ہوں میں
کیوں کسی زلف کی بلا میں پھنسوں | کیوں گرفتارِ پیچ وتاب ہوں میں
دیکھے خط کون انتظار کرے | اپنے قاصد کے ہم رکاب ہوں میں
کیوں کسی چشمِ مست کو دیکھوں | مفت آلودۂ شراب ہوں میں
داغ کو کیا خوفِ صرصرِ عصیاں | خاکِ پائے بوتراب ہوں میں

عذر آنے میں ہے اور بلاتے بھی نہیں | باعثِ ترکِ ملاقات بتاتے بھی نہیں
منتظر ہیں دمِ رخصت کہ یہ مر جائے تو جائیں | پھر یہ احسان کہ ہم چھوڑ کے جاتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں | صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

اشعار متفرق

ہاتھ ہم سے ملاؤ اے موسیٰ | عاشقِ روئے یار ہم بھی ہیں
روکتا ہے جب ہمیں دربانِ یار | شعر لکھ آتے ہیں ہم دیوار پر

مری بزم کا عیش سُنکر وہ بولے ‏ ‏ اگر موت ہے تو غافل یہی ہے
واعظ تجھے دکھائیں گے ہم کوئے یار بھی ‏ ‏ جا پہونچے ایک دم میں یہ خلدِ بریں نہیں
محشر میں حسینوں کی طرف تاک لگائے ‏ ‏ وہ میں ہی تو ہوں گا رہے تجھ کو پتا یاد
جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا ‏ ‏ دبے آپ سے، وہ کوئی اور ہوگا
ہر ایک میں عیب نکلیں گے کہاں تک ‏ ‏ نہتی اچھے سبھی سارے جہاں سے
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ‏ ‏ ایسی جنّت کو کیا کرے کوئی
کہتے ہیں وہ جلائیں گے تجھ کو حشر تک ‏ ‏ دشمن کی قبر تیرے برابر بنائیں گے
نہیں کھیل ہے داغ یاروں سے کہہ دو ‏ ‏ کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے
یہ حوروں پہ مرتا ہے بے دیکھے بھالے ‏ ‏ نہیں کوئی عاشق مسلماں سے بڑھکر

دبیر

نام مرزا سلامت علی تخلص دبیر خلف مرزا غلام حسین شاگرد میر ضمیر سنہ ۱۸۰۳ء میں آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ۔ سات سال کی عمر میں والد کے ساتھ لکھنؤ آگئے۔ فارسی اور عربی کی کتابیں مولوی غلام ضامن اور مرزا کاظم علی اخباری سے پڑھیں۔ شعر و سخن کا شوق تھا۔ مرثیہ گوئی کی طرف رجوع ہو گئے۔ آپ کے مرثیوں میں جا بجا غم انگیز اشارے اور دردناک اور المناک مضامین دل گداز انداز میں پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں وفات کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

رُباعیات

پروانے کو دھن شمع کو لَو تیری ہے ‏ ‏ عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب ‏ ‏ جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

پہونچا جو کمال کو، وطن سے نکلا ‏ ‏ قطرہ جو گہر بنا، عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل ‏ ‏ پختہ جو ثمر ہوا، چمن سے نکلا

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں   منھ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہہ نے بیدل   تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

صبح کا سماں

گلگونہ شفق جو ملا حورِ صبح نے   اسپیدِ مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیِ طورِ صبح نے   ٹھنڈے چراغ کر دئے کافورِ صبح نے
لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے انجمِ درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سفیدۂ طلعتِ نشانِ صبح   سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ صبح کا پھینکی کمانِ صبح   چرخِ چہارم پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
رُخ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

بڑھکر نقیبِ نور پکارا اسے سحر   ذرّوں میں نورِ مہر در آیا قہر قہر
فرماں نجوم و بدر کو پہونچا بدر بدر   لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
بُرقع جو اٹھ گیا تھا رُخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح مُلمّع نقاب کا

معرکۂ جنگ

صحرا سے شہر بھاگ گئے سوئے کوہسار   قول و قرار کو نہ رہی طاقتِ قرار
اسواروں پر اجل کا پیادہ ہوا سوار   پسپا ہوئے پیلے تو پرزے رسالہ دار
بھاگے نیام قبضۂ شمشیر چھوڑ کر
رن سے چلی کیاں کو کماں تیر چھوڑ کر

برقِ تیغ ملنے کو جس فرق پر جھکی   واں نقدِ دل جلا تو ادھر جنسِ جاں پھکی
سمجھا تھا سر کہ خود پہ کاندھے پہ وہ رُکی   گردن پکاری دیکھ یہ سینہ پہ جا چکی

قاروں کے دل پہ خنجرِ خوفِ اجل لگا
گاوِ زمیں کی شاخ میں سو بار پھل لگا
افلاک ڈر سے تیغ کے تھرا کے رہ گئے
گرنے کو سر زمین پہ نہوڑا کے رہ گئے
سردارِ شام تیغ کو چمکا کے رہ گئے
نہ لڑ سکے نہ بڑھ سکے شرما کے رہ گئے
سورج کی شکل روپ سے بدروپ ہو گئی
روپوش اس کے پرتوے سے دھوپ ہو گئی

چمکی جو خود سر پہ تو سر سے نکل گئی
مثلِ قرار سب کے جگر سے نکل گئی
سینہ میں دم لیا تو کمر سے نکل گئی
حیراں تھا خود بدن کہ کدھر سے نکل گئی
اونچی ہوئی تو فرقِ عدو کو فرو کیا
گر کر اٹھی تو راکب و مرکب کو دو کیا

گاوِ زمیں کے یہ کفِ پا سے نکل گئی
پیرِ فلک کی پشتِ دوتا سے نکل گئی
فوق السماؤ تحتِ ثریٰ سے نکل گئی
اک سانس میں یہ بڑھ کے ہوا سے نکل گئی
جاتی تھی دھوپ مثلِ پرندہ اڑی ہوئی
ہر سوئے تیغ خوف سے گردن مڑی ہوئی

بجلی گرائی آگ لگائی رواں ہوئی
گرمی دکھائی خوں میں نہائی رواں ہوئی
سوئے صف آئی کر کے صفائی رواں ہوئی
تن میں سمائی دل میں در آئی رواں ہوئی
یاں تڑپی واں گری اِدھر آئی اُدھر گئی
اس چال میں یہ موت کو بھی مات کر گئی

درد

نام سیّد میر خواجہ میر تخلص دردؔ خلف خواجہ ناصر عندلیب۔ ۱۱۲۳ھ میں آپ دہلی میں پیدا ہوئے اور والد کے آغوش میں تربیت پائی۔ بائیس ۲۲ سال کی عمر میں دنیا سے منھ موڑ کر والد کے سجادے پر بیٹھ گئے۔ گلشن صاحب کے مرید تھے آپ کا خاندان پیری مُریدی کے سبب دہلی میں معزز تھا۔ موسیقی میں اچھی مہارت

رکھتے تھے۔ آپ کا کلام پُر درد ہے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ یعنی ۱۷۸۵ء میں رحلت کی۔

چمن میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اس نے قصداً بھی میرے نالے کو — نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا
دیکھئے غم سے اب کے جی میرا — نہ بچے گا، بچے گا کیا ہوگا
قتل سے میرے جو وہ باز رہا — کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کِھلا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہوکر چشم تر شبنم — بہارِ باغ تو یوں ہی رہی لیکن کدھر شبنم
ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا — اِدھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی اُدھر شبنم
کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیرِ صحبت صاف طبعوں کی — ہوئی آتش سے گل کے بیٹھتے اشکِ شررِ شبنم
بھلا ٹک صبح ہونے دو اسے بھی دیکھ لیویں گے — کسی عاشق کے رونے سے نہیں رکھتی خبر شبنم
نہ سمجھا درد ہم نے بھید یاں کی شادی و غم کا — سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے — اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے
اخفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے — یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے
مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جسکو حشر — اے درد چاہے لائے بخود پر نہ لا سکے

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل میں نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں — ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار — کس بات پر چمن، ہوسِ رنگ و بو کریں

مدرسہ یا دیر تھا کعبہ تھا یا بتخانہ تھا — ہم سبھی مہمان تھے واں اک تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں — آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہوگیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

کرتا ہوں پس از مرگ بھی حل مشکلِ عالم — بے حس ہوں ناخن کی طرح عقدہ کشا ہوں
ہے مظہرِ انوارِ صفا میری کدورت — ہر چند کہ آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں
احوالِ دو عالم ہے مرے دل پہ ہویدا — سمجھا نہیں تا حال پر اپنے تئیں کیا ہوں
آزاد نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز — ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جُدا ہوں

منظور زندگی سے تیرا ہی دیکھنا تھا — ملتا نہیں جو تو ہی پھر کیا ہے زندگانی
محتاج اب نہیں ہیں ناصح نصیحتوں کے — ساتھ اپنے سب وہ باتیں لیتی گئی جوانی
میرے غبار کا کچھ پایا نشاں نہ ہرگز — صحرا میں جا صبا نے ہر چند خاک چھانی

قطعات

شمشیر کھینچ قاتل سر پر جو میرے آیا — مرنے کی آرزو میں گردن میں اپنی خم کی
فرمایا تب یہ اس نے اے کشتۂ محبت — فرصت ہے ٹک غنیمت کر شرح اپنے غم کی
میں نے کہا کہ یہ غم وہ غم ہے جس کو لکھے — کاغذ کی چھاتی پھٹ جا کٹ جا زباں قلم کی
پھر میں تمام کیونکر اس درد کو سُناؤں — دل میں ہزار باتیں فرصت ہے ایک دم کی

پوچھا میں درد سے کہ بتا تو سہی مجھے — اے خانماخراب ترا ہے بھی گھر کہیں

کہنے لگا ارکانِ معیّن فقیر کا | لازم ہے کیا کہ ایک ہی جا گھر ہو ہر کہیں
درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے دوست | تو نے سُنا نہیں ہے یہ مصرع مگر کہیں

نامۂ درد کو مرے لیکر | پاس جب یار کے گیا قاصد
پڑھ کے کہنے لگا وہ سرنام | کون سا یار ہے بتا قاصد
جس نے بھیجا ہے تیرے ہاتھ یہ خط | میں نہیں اس سے آشنا قاصد

ذوق

خاقانیٔ ہند محمد ابراہیم متخلص ذوقؔ۔ آپ عمر رمضان ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول کے مکتب میں تعلیم حاصل کی۔ حافظ صاحب شاعر بھی تھے اور شوقؔ تخلص فرماتے تھے۔ ان ہی کی محبت سے آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور کچھ کہنے لگے۔ جب سنِ تمیز کو پہونچے تو شاہ نصیر سے وابستہ ہو گئے۔ چند دنوں میں مشقِ سخن بڑھ گئی اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے رفتہ رفتہ آپ کی رسائی دربارِ شاہی تک ہو گئی اور بہادر شاہ ظفر نے آپ کو اپنا اُستاد تسلیم کر لیا اور آپ کو خاقانیٔ ہند کے لقب سے نوازا اور سو روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ بھی مقرر ہو گئی۔ آخر میں ایک گاؤں بھی جاگیر میں دے دیا۔ ۱۲۷۱ھ میں وفات کی۔

رُباعیات

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کی پیسے | سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ویسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوقؔ | پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے ئیسے

اے ذوقؔ کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا | اک دم نہ ترا حرفِ مناجات ہوا
تھا جب کہ جواں تھا جوانِ بدمست | جب پیر ہوا پیرِ خرابات ہوا

اے ذوقؔ کرے گا کوئی دُنیا کیا ترک | دُنیا ہے بُری بلا ارے کیسا ترک

ممکن نہیں ترک ہو کسی سے دُنیا
جب تک نہ کرے آپ اسے دنیا ترک

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

ہے جی میں اپنے غرّۂ جوہر کو توڑ دوں
آئینۂ خیالِ مکدّر کو توڑ دوں

احسانِ ناخدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

راہِ جنوں میں جلد اٹھاؤں جو میں قدم
پائے رفیق و ہمتِ رہبر کو توڑ دوں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی
باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں

نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتّھر کو توڑ دوں

پھر اس فقرہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھو کے میں سرِ نشتر کو توڑ دوں

اوّل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں وہ ناف سے

چل میکدہ میں شیخ بسر کر تہہِ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

پھینکے ہے ایک جنبشِ مژگاں میں وہ پری
اس اپنے ناتواں کو پرے کوہ قاف سے

لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود
لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہان کو زیب اختلاف سے

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر اک کڑی دو گھڑی کے بعد

کل ہم نے اس سے ترکِ ملاقات کی تو کیا
پھر اس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر دیکھ جلد آ
آنے میں ہوگی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوق کس طرح
پھر تو نہ ٹھہرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

کل گئے تھے ہم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر　　چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر
سرد مہری سے کسی کی آگئے ہی دل سرد ہے　　یاں سے ہٹ جا دھوپ لے ابرِ بہاراں چھوڑ کر
سرخیِ پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں کی ترے　　اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیحِ مرجاں چھوڑ کر
گھر سے بھی واقف نہیں اس کے کہ جس کے واسطے　　بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر
ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن　　کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے　　تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے
کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم　　آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے
کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب　　یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

پی بھی ذوقؔ نہ کر پیش و پسِ جامِ شراب　　لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جامِ شراب
ساقی اس دور میں کب آنکھ چرا سکتا ہے　　رات بھر گشت کرے عسسِ جامِ شراب
مرغِ دل نرگسِ میگوں کی ہو مژگاں میں اسیر　　تازہ مضموں سے جو باندھوں قفسِ جامِ شراب

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے　　اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے　　پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو ہو معلوم وقتِ مرگ　　ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

وقتِ پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد　　کر شراب و کباب کی باتیں
ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ　　ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

اشعار متفرق

اے ذوقؔ دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مرے نالوں سے چپ ہیں مرغِ خوش الحان زمانے میں
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

گندم سے ہے سینہ چاک فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہیں سو وہ بھی جدا ایک سے ایک

رکاؤ خوب نہیں طبیعت کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

لپٹنے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

لاشے کو پھینک دیجے میرے کہ دفن کیجے
مردہ بدست زندہ جو چاہے سو کیجے

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے
یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اتار دے

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

دردِ دل سے لوٹتا ہوں میرا کس کو درد ہے
ہوں وہ لفظِ درد جس پہلو سے لو درد ہے

راسخ

نام شیخ غلام علی تخلص راسخ باشندہ عظیم آباد شاگرد جناب فدوی و میر تقی میر ۱۲۲۳ھ میں رحلت کی۔ دیوان اور مثنویات راز و نیاز حسن و عشق و سبیل نجات آپ سے یادگار ہیں۔

نگراں کبھو نہ یہ جانبِ رخِ دلفریب پری رہی
مری چشم مندتے مندتے تک تری محوِ جلوہ گری رہی

پسِ مرگ جسمِ نزار کا لہو خشک ہو گیا سب ولے
وہی خوں رہا دلِ خوں شدہ وہی چشم کی یہ تری رہی

تمہیں گل کی جس نے بتایا جو کہا اس نے مجکو صبا ہو تو
وہاں تم تو پردہ نشیں ہوتے یاں مجھ کو دربدری رہی

مرے پاس جنسِ ہنر تو تھی ولے بود و باش تھی میری واں
کہ متاعِ بیش بہا سدا جہاں جنسِ بے ہنری رہی

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد نہ مجھے رشک تھا تو انھوں پہ تھا
جنھیں ترے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

یہ جواب ہے آخرِ عاشقی کبھی ہوش ہو کبھی رفتگی
نہ وہ گریۂ دلِ شب رہا نہ وہ زاریِ سحری رہی

جگر اور دل سبھی رکھتے تھے وے ہوسکا نہ کوئی طرف
ہدف اس کے ناوکِ ظلم کی یہ مری ہی بے جگری رہی

مجھے سونپ کر غمِ ہجر وہ ہوئے یوں جدا کہ نہ پھر ملے
مرے دل میں تا دمِ واپسیں وہ امانت ان کی دھری رہی

نہ تھی چشمِ راسخِ خستہ دل کبھو خالی اشک سے دوستاں
شب و روز جامِ پُر آب کی روش آنسوؤں سے بھری رہی

اشعار متفرق

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشمِ مہر و ماہ کا
آنکھ ڈالا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

دشمنی در پردہ کی اے وائے تم نے کیا کیا
آپ تو پردے میں تھے اور ہمیں رسوا کیا

اپنی جانب تھا کشاں ہر عضو تیرے درد کو
ہائے رے لذت کہ جھگڑا جسکا ہم دیگر رہا

کب میرا خریدار ہو موجد وہ جفا کا
بندہ تو ہوں ہے عیب ولے مجھ میں وفا کا

سونپا ہوا داغ ان کا تازہ ہے سدا رکھا
ہم نے اس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

حیاکے پردہ میں مارا ہے ایک عالم کو
شہید میں تو ہوں ان شرملیں نگاہوں کا

ٹھنڈی سانسیں یادِ رخ میں اسکی بھاتی ہیں مجھے
چاندنی میں لطف ہے چلنا ہوائے سرد کا

دل قیمتی ہوا جو شکست آشنا ہوا
یہ شیشہ ٹوٹنے سے جواہر بہا ہوا

گزرے جو وہ خیال میں نازکی سے ہائے
یہ رنگ ہو اکہ پھول ہو جیسے ملا ہوا

یہ دلِ بیتاب و ضبطِ سوزِ عشق عجوبہ ہے
قطرۂ سیماب میں آتش کدہ پنہاں ہوا

جز داغ ہے کیا اس دلِ حزیں میں
لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

انکار ہے ان کا لذت آمیز
ہے زورِ مزا نہیں نہیں میں

اب اور لگتا ہو نئے ایجاد گلستاں میں — راتوں کو لگا پھرنے صیّاد گلستاں میں

کیوں بڑھاتے ہو تم اسبابِ خود آرائی کو — طول مت دو مری بدنامی و رسوائی کو

مجھے تحریکِ آہ سرد نے کیا کیا رولایا ہے — یہی ہے جبکہ ٹھنڈی یاد تب میٹھ آیا ہے

ملیں حضرتِ راسخ ہم سے اگر تو یہ پوچھیں گے ان کی جناب میں ہم
کہو قبلہ و کعبہ وہ کیسا تھا گل تمہیں کاٹنا جس کی ہوا نے کیا

رشک

نام میر علی اوسط تخلص رشک ولد میر سلیماں۔ باشندہ لکھنؤ شاگرد حضرت ناسخ لکھنوی۔ آپ ناسخ کے شاگردوں میں قابل شاگرد مانے جاتے تھے۔ کربلا کی زیارت بھی کی ہے۔

جو رنج نوشتہ میں ہے کیوں کر نہ ملے گا — لکھوائیں گے نامہ تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اس مہِ تاباں نے الٹ دی — تاروں کو نشانِ مہِ انور نہ ملے گا

کاہیدگیِ جسم اگر یوں ہی رہے گی — ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

ساتھ ترے سوئیں گے یا گور میں جاکر — مدفن تو ملے گا جو ترا گھر نہ ملے گا

بوسہ ہمیں دیتا ہے تو دے دونوں لبوں کا — یوں مزۂ قندِ مکرّر نہ ملے گا

بالغرض کہ ہے سروِ چمن تیرے برابر — پر ہم کو مزہ تیرے برابر نہ ملے گا

انصاف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت — اے رشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

رویا ہمیں بے وفا ہمارا — انجام اچھا ہوا ہمارا

قاصد کا مزاج ہے فلک پر — اس ماہ نے خط پڑھا ہمارا

دل کا جو ملا کوئی خریدار — جھگڑا چک جائے گا ہمارا

دل کا غم کیوں نہ کھائیں اے رشک — غم خوار قدیم تھا ہمارا

چاول۔ الماس۔ گوشت۔ لختِ جگر — فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں

میرے کھانے سے فلک کیوں ہے کباب
پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں
اور کیا ہے ترا لبِ دہن
یہ اگر قند کا چواؤ نہیں
اب کے جاڑے میں نالہ و آہ
اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
یہ زمینِ غزل وہ ہے اے رشکؔ
جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

وقتِ حساب کثرتِ اغیار وصل میں
کہتے ہیں بات ٹال کے گنتی خلط ہوئی
سودا ہے حامیانِ قیامت کا آپ کو
تعدادِ جرم اہلِ معاصی عفت ہوئی
پروائے حرف گیریِ اہلِ سخن نہیں
اے رشکؔ مستند ہے جو کتابِ لغت ہوئی

اس رات کو سمجھیں گے شبِ ماہِ تمام
اپنے آغوش میں جب وہ مہ تاباں ہوگا
ایک دن کام ہی آجاتا ہے کھوٹا پیسا
داغ سینہ کا چراغِ شبِ ہجراں ہوگا

محبت نبھے تب کہ ہو خانۂ دل
ہمارا تمہارا تمہارا ہمارا
ہم اے رشکؔ مرتے رہے آبرو پر
رہا نقش بر آب نقشا ہمارا

کہاں یہ لطف جیتے نے کمر پائی اگر پتلی
تمہارے ہونٹ پتلے انگلیاں پتلی کمر پتلی
فقط بجھ میں عناصر نے عجب ترتیب پائی ہے
بدن شفاف شانے گول قد موزوں کمر پتلی

اشعار متفرق

تنتے پھرتے تھے جوانی میں جھکے پیری میں ہم
جب ارادہ اور تھا اب اور ارادہ ہوگیا
ہے نام کو ثبات جو اچھا نکل گیا
کیا اعتبار دم کا رہا یا نکل گیا
دل و دیں زلف روتا مانگے ہے
مانگ کیا جانیے کیا مانگے ہے
نہ دکھا کوٹھے پر قدِ موزوں
چاند ہے کیا ترے برابر کا
اپنی وحشت کا پتا دوں اور کیا
نام مجنوں ہے مرے ہمراز کا

ہجر میں تاب تواں ہوش وحواس
سب گئے دھیان تمہارا نہ گیا

اہلِ رفعت کیلئے نقص کمی بیشی نہیں
چاند سا کس روز سورج گھٹ گیا یا بڑھ گیا

تقدیر بھلی ہو تو غمِ بے ہنری کیا
ناقص کو دیا اس نے کمال اور طرح کا

دیر لگتی نہیں بستی کو خرابا ہوتے
آج اٹھا قصرِ فلک مرتبہ کل بیٹھ گیا

دیدہ سمندر سے سوا ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا

کس کو رکھتی نہیں بیتاب ترے گھر کی تلاش
آدمی کیا یہ اثر قبلہ نما تک پہونچے

زنجیر اسے چاہیے جو زور دکھائے
کافی ہے ترے زار کو زنجیر کی تصویر

دست بوسی کرتی ہے تصویرِ پشت آئینہ
اے بتو اللہ رے تقدیرِ پشتِ آئینہ

یار من من کے بگڑ جاتا ہے
کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے

رشکی

نواب محمد علی خاں متخلص رشکی خلف الرشید نواب حاجی محمد مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہ رئیسِ اعظم دہلی شاگرد مرزا غالب۔ آپ فارسی کلام بھی خوب کہتے تھے۔

آنکھیں ملانے میں ہے عبث تم کو احتراز
آنکھیں ہیں دل نہیں کہ ملایا نہ جائیگا

گر ایک بار رُخ سے نقاب اس کے اٹھ گیا
پھر رازِ دل کسی سے چھپایا نہ جائیگا

نبضیں چھٹی ہیں آنکھوں میں دم ہے لبوں پہ جاں
آؤ کہ کوئی دم میں بلایا نہ جائیگا

رنجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا
لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا

مانگی جو اس نے جان تو غیروں پہ آبنی
حالانکہ اک ہنسی تھی فقط امتحاں نہ تھا

اک محشرِ خیال دلِ تنگ تھا کہ کیوں
در پر تمہارے رات کوئی پاسباں نہ تھا

وہ وہ کئے ہیں جرم کہ کم ہونگے اور سے
کیا کیا امیدوارِ تعزیر کر چکے

تدبیر کب بتانے کو احباب آئے ہیں
جب کام ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

آیا خیال بے گنہی کا انھیں تو کب
جب وقت وہ مجھے تہِ شمشیر کر چکے

وہ باتیں جو کہ ان سے تھیں چھپانی — غضب ہے کر رہا ہوں میں انھیں سے
وہ پھرنا کوبکو رشکی کہاں ہے — ہوئے ہیں آپ بھی اب تو ہمیں سے

وہ آئے تھے مری بھی چوری گئی رات — مرا چونک پڑنا بلا ہو گیا
مرا عقدۂ بخت کھلتا نہیں — ترا یہ بھی بندِ قبا ہو گیا

اشعار متفرق

کیا کیا بنا کے ہم نے سنایا رقیب کو — مضمون تیرے نامۂ الفت طراز کا
ہم وہ گم کردہ راہ ہیں کہ کبھی — خضر بھی رہنما نہیں ہوتا
ہے دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکی کا حال — رحم آتا ہے مجھے اس کی جوانی دیکھ کر
اس عنایت کے کبھی قابل یہ گنہگار نہیں — سینکڑوں خون کیا کرتے ہو دوچار نہیں
رات کو بات نہ کی اس نے سحر تک ہم سے — اور جو کچھ کہ ہوا قابلِ اظہار نہیں
نہ سلجھے گی تمہاری اور دشمن کی قیامت تک — اگر الجھا ہمارا دل تمہاری زلفِ پیچاں میں
یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
مرا اقوال سنکر بے تکلف — کہا کیا سچ یہ ساری داستاں ہے
وقتِ وفائے وعدۂ دشمن نہیں اگر — پھر تری بات بات میں اضطراب کیوں ہے
قیس کی دھوم مچ رہی ہے مگر — عشق مجھ سے سوا نہیں ہوتا

رفعت

نام مرزا پیارے متخلص رفعت باشندہ دہلی۔ شاگرد عبدالرحمٰن خاں احسان و مولوی امام بخش صہبائی آپ امیر تیمور گرگانی کی اولاد میں تھے۔

ہم خوش تھے کہ محشر میں تو دیکھیں گے دیدار — لیکن یہ قیامت ہے کہ محشر نہیں ہوتا
کس منہ سے کروں دل کی شکایت کہ برا ہے — مجھ سے جدا وہ کبھی دم بھر نہیں ہوتا

ہو برا بیتابی دل کا کہ اس کے ہاتھ سے — رازِ پنہاں ایک عالم پر نمایاں ہو گیا

یا الٰہی درد کس پردہ نشیں کا تھا کہ شب
دل میں اٹھ اٹھ کر مرے دل ہی میں پنہاں ہو گیا

مژہ کو چھیڑے تو مدت ہوئی پہ یہ اب تک
چبھی ہے خار سا سینے کے درمیاں کیسا
خدا نہ کردہ کرے نالہ اگر ترا عاشق
تو پھر زمین یہ کیسی یہ آسماں کیسا

کچھ آنکھ کا گیا نہ گیا کچھ خیال کا
مارا گیا دل اور یہی بے قصور تھا
کچھ پاس غیر کچھ وہ تغافل شعاریاں
گویا کہ سامنے بھی میں نظروں سے دور تھا

رحم اس کا ہو کہ نالے کا اثر ہو کچھ ہو
نزع میں بارے وہ لینے کو خبر آ ہی گیا
تھا ہدف غیر پر اپنا جو مقدر تھا دوست
غلط انداز سے وہ تیر ادھر آ ہی گیا
آج کچھ رفعت دل خستہ کا احوال ہے غیر
جو کہ دھڑکا تھا سو وہ پیش نظر آ ہی گیا

شب وصال میں دیتا ہے لطف کیا کیا کچھ
ہر ایک بات پہ عالم یہ منھ بنانے کا
نہ ان کو ناز سے فرصت کہ ہم سے ہو کچھ چھیڑ
نہ ہم کو ضعف سے یارا ستم اٹھانے کا

پوچھے اشک اس نے گمان غیر میں
مر گئے ہم اتنے ہی احسان میں
جان اجل کو دینگے اک جھگڑے کے ساتھ
تو ہے جو دے دیں تجھے اک آن میں

اشعار متفرق

ہیں اک وہ بھی کہ ان کو ہے تم سے راز و نیاز
اور اک ہم ہیں کہ منھ تکتے ہیں زمانے کا
گم ہو گئی شاید بت و بتخانہ کی الفت
کچھ ان دنوں آتا ہے جو رہ رہ کے خدا یاد
ہائے یانی بھی چوانے کو نہ آیا دم مرگ
کوئی جز گریہ حسرت ترے بیمار کے پاس
لب ہیں جانبخش یہ کیسے کہ میں ان کی خاطر
اپنے جینے ہی سے مایوس ہوا جاتا ہوں

رمز

مرزا فتح الملک بہادر ولی عہد ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ متخلص رمز باشندہ دہلی شاگرد محمد ابراہیم ذوق دہلوی۔

دل مرے سینہ میں یہ کوئی ستم پیدا ہوا / جب سے دل پیدا ہوا ساتھ اس کے غم پیدا ہوا
دل میں آتی ہے نظر اپنے مجھے تصویر یار / کیا تماشا ہے کہ کعبہ میں صنم پیدا ہوا
مجھ سے کی ہے درد نے پہلو تہی جس روز سے / درد پہلو میں ہمارے دم بہ دم پیدا ہوا
دیکھتے ہیں سارے عالم کا تماشا دل میں ہم / ساغر دل اپنا بہ رشک جام جم پیدا ہوا
ہے مرا سینہ کہ یا رب کوئی دار الضرب عشق / داغ جو پیدا ہوا شکل درم پیدا ہوا
میں وہ مجنوں ہوں کہ جسکے باغ جنت میں بھی رمز / خار صحرائے جنوں زیر قدم پیدا ہوا

ہمیں منظور آج ان کو بلانا ہے بلانا ہے / بلا کر داغ دل اپنا دکھانا ہے دکھانا ہے
ہجوم داغ دل کیا پوچھتے ہو میرے سینہ میں / خزانا ہے خزانا ہے خزانا ہے
جگر میرا ترے تیر نگہہ کا ایک مدت سے / نشانا ہے نشانا ہے نشانا ہے
کہیں کیا اس پری سے وہ مجھے ہر دم یہ کہتا ہے / دوانا ہے دوانا ہے دوانا ہے
ہنسو کیونکر نہ غیروں سے کہ منظور آپ کو میرا / رولانا ہے رولانا ہے رولانا ہے
شہادت سے مری اب تک زبان تیغ قاتل پر / فسانا ہے فسانا ہے فسانا ہے
نہ بھڑکے دل میں رمز آگ کیوں آنسو نہ جاری ہوں / کہ شیوہ واں رقیبوں کا لگانا ہے لگانا ہے

اشعار متفرق

آنکھیں تو اس کو دیکھ کر ہوتی ہیں بے قرار / بن دیکھے دل تڑپنے لگا اس کو کیا ہوا
کیا قتل ظالم نے کس کس ادا سے / ملا مجھ کو قسمت سے جلاد اچھا
سب کچھ آسان ہے تجھے اے گردش دوراں / ایک مشکل مری مشکل کا ہے آسان کرنا
مانا کہ نہ دل لیکے تو مجھ سے وفا کرتا / پر دل کی تسلی کو وعدہ تو کیا کرتا
طرز رفتار نے تری ظالم / رفتہ رفتہ مجھے تمام کیا

وہ لے گئے ہیں خدا جانے کس طرح دل کو
دیا ہے میں نے انھیں اپنے اختیار سے کیا

تم رہو اور مجمع اغیار
میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

دلِ بیتاب کو تجھ سے رفاقت کی کیا امید
کون ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تو ہوگا

اس شوق کو میں نامہ میں القاب کیا لکھوں
مشفق نہیں شفیق نہیں مہرباں نہیں

دردِ فراق۔ فکرِ عدو۔ طعنِ دوستاں
اس ایک جان پر مری کیا کیا بلا نہیں

وصل کی شب حشر کا دن ہو شاید کچھ کہیں
اس قدر شکوے ہیں دل میں اس ستمگر سے ہمیں

ہم کو کیا غیر کے آنے کی خبر
چغلیاں نقشِ قدم کھاتے ہیں

نہ حرم میں جگہ نہ دیر میں جا
ہم گئے جائیں اے خدا کس میں

رمزؔ الفت میں جو چاہو آرام
تو یہ راحت طلبی جانے دو

ہوئی صورت نہ کچھ اپنے شفا کی
دوا کی مدتوں برسوں دعا کی

یادِ بُت میں عمر گزری یاں تو رمزؔ
کیا کہو گے واں خدا کے سامنے

دل لے تو گئے ہیں وہ ہمارا
پر دیکھئے اس کو کیا کریں گے

الٰہی موت تو ہوگی مگر یوں ہو تو بہتر ہے
کہ سر ہو پاؤں پر قاتل کے اور سجدے میں دم نکلے

رنگین

نام سعادت یار خاں تخلص رنگینؔ ولد طہماسپ بیگ خاں۔ باشندہ دہلی شاگرد شاہ حاتمؔ۔ آپ فنونِ سپاہ گری سے بخوبی واقف تھے۔ بہت سے شہروں کی سیر کی ہے۔ ریختی زبان کے موجد تھے کچھ لوگوں نے انشاؔ کو ریختی کا موجد لکھا ہے جو غلط ہے۔ خود انشاؔ صاحب نسخہ دریائے لطافت میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے ریختی زبان کا فن سعادت یار خاں رنگینؔ سے اخذ کیا ہے۔ دیوان ریختہ و ریختی ہزل فرسنامہ و حکایت رنگین۔ مثنوی وغیرہ آپ سے یادگار ہیں۔ ۱۲۵۱ھ میں قریب اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رُباعی

اے موجدِ عیش و شادمانی پھر آ
اے باعثِ لطف زندگانی پھر آ

میں ہوں بن تیرے چشمِ خوباں میں ذلیل
پھر آ تو اب اے میری جوانی پھر آ

قطعہ

حوروں کے عیوض مجھے الٰہی دُنیا میں تو اک نازنیں دے
کب مجھ کو بہشت کی ہے خواہش دینا ہے جو کچھ مجھے یہیں دے

اشعار متفرق

جی جلاکر ایک بوسہ مانگتے ہیں یار سے آگے یا قسمت وہ دیکھیں ہاں کرے ہے یا نہیں
جو نالہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا
کھینچ لائی ہے اسے اے کشش دل یاں تک بارے صد شکر کہ مجھ کو بھی یہ مقدور ہوا
تھی شعلہ یا وہ برق کہ جی میرا جل گیا ایسے ہی کی نگاہ کہ بس دم نکل گیا
ربط ہم سے آپ نے جواب بہت کم کر دیا سچ بتاؤ تم کو صاحب کس نے برہم کر دیا
کیا کرتے ہو ناصح نصیحت رات دن مجھ کو اسے بھی ایک دن کچھ جاکے سمجھاتے تو کیا ہوتا
پرندے کا نہیں مقدور جو واں جاکے پَر مارے کبوتر گر ہمارا نامہ بر ہوگا تو کیا ہوگا
قسم ہے ایک عالم کو رولا دیتا ہے اے رنگیں وہ اس کی جھڑکیاں کھاکر ترا مجبور ہو جانا
بازگشتی تیر ہے پھر کر یہ تیرا دیکھنا صدقے تیرے، اس ادا پر سے مجھے قربان کر
زاہد بتا تو کعبہ میں کیا دیکھتا ہے تو جاتے ہیں دیر میں تو صنم دیکھتے ہیں ہم
گھر سے تیرے اُٹھ کے میں جاتا ہوں روتا اس طرح جیسے تو مکتب کو جاتا تھا کسی ہنگام میں
تیرے گل تکیوں کی خاطر ہے یہی لازم، کہ ہو ایک تو شمس کا اور ایک قمر کا تکیہ
وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگیں اس میں کیا تیری شان جاتی ہے
میری چھاتی سے لپٹ جایئے اور سو رہیئے آیئے آیئے بس آیئے سو رہیئے
کس رات ہوئے آپ ہیں مہمان ہمارے کب ہم نے نکالے کہو ارمان ہمارے
دم آیا ناک میں اس آہ اور زاری کے جینے سے طبیبو موت ہی بہتر ہے بیماری کے جینے سے
رُوح نے جسم پر گرانی کی اب یہ حالت ہے ناتوانی کی
دم بدم بسکہ ترا حسن فزوں ہے ظالم روز جی میں ہے کہ کھنچوایئے تصویر نئی
غرض مند اپنے مطلب سے رکھے ہے کام اے رنگیں وہ آئے یا نہ آئے میں بلائے بن نہیں رہتا

اسے ہے شوق کہانی کا ان دنوں میں بہت — یہ طور خوب ہے احوالِ دل سُنانے کا
کرا نہ دل میں تو انصاف میں روٹھا ہوں کیونکر — گلے میں ڈال کر باہیں منانا یاد آیا
اسے میں چھپ کے دیکھوں برملا وہ غیر کو دیکھے — بھلا یوں دیکھنا دیکھو تو دیکھا جائے ہے مجھ سے

غزل ریختی

کروں میں کہاں تک مدارات روز — تمہیں چاہیے جی وہی بات روز
مجھے گھر کے لوگوں کا ڈر ہے کمال — کروں میں کس طرح ملاقات روز
مرا تیرا چرچا ہے سب شہر میں — بھلا آؤں کیونکر میں ہر رات روز
کہاں تک سنوں کان تک تو اڑ گئے — تری سُنتے سُنتے حکایات روز
گئے ہیں مرے گھر میں سب بجھ کو تاڑ — کیا کر نہ رنگیں اشارات روز

میں تو وہ اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی — باجی مجھے اوڑھا دے جھلا جھل کی اوڑھنی
برسات اس کو کہتے ہیں جی جس بہار میں — سر پر ہوا کے ہوتی ہے بادل کی اوڑھنی
پہونچی لچک کمر کو ارے لوگو دوڑیو — کو ہے نک جو سر سے مری ڈھلکی اوڑھنی
بھاوج بنت منگادے کہ رنگیں لگاؤں میں — سر پر مرے ٹھہرتی نہیں ہلکی اوڑھنی

متفرق اشعار ریختی

جی تڑپے ہے تجھ بن مرا اے جان دوگانا — وہ جائیے گھر آج تو جہان دوگانا
ترے گھر میں زناتی آئی کب — میں نگوڑی بھلا نہائی کب
ایک مدت سے ترستی تھی ملاقات کو میں — صد شکر کہ یہ صلاح ہوئی رات کو میں
چلی دوگانا چھاتیوں سے چھاتیاں مل مل گھسیں — بدن بدن پر ہم بدن کو رگڑیں اور سدل گھسیں
آج فرصت نہیں کل رات کی ٹھہرا کے اٹھو — بات بندی سے ملاقات کی ٹھہرا کے اٹھو
صبح کو اٹھ کے تم گھر کو اجی جاؤ گے — یہ فریاد بھلا پھر بھی کبھی آؤ گے
ٹیس بیڑوں میں اٹھی او ہی مری جان گئی — مت ستا تجھ کو دوگانا ترے قربان گئی

رند

نام سید محمد خاں متخلص رند۔ آپ ۱۲۱۲؁ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے
۱۲۴۰؁ھ میں آپ لکھنؤ آگئے۔ جب تک آپ فیض آباد میں رہے میر انیس کے والد
میر خلیق صاحب سے مشقِ سخن کرتے رہے۔ لکھنؤ آکر آپ آتش صاحب کی شاگردی
میں آگئے۔ پہلے آپ وفا تخلص اختیار کئے ہوئے تھے مگر استاد نے آپ کو رند بنا دیا۔
غدر سے چند سال پیشتر جب آپ بیت المقدس کی زیارت کو تشریف لے جا رہے تھے
تو بمبئی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

منزلِ مقصود کا سودا اگر ہو جائیگا
مثلِ جادہ راستے میں اپنا گھر ہو جائیگا

جائے سے باہر جو مشتاقِ سفر ہو جائیگا
گرم رفتاری میں ہم سنگِ شرر ہو جائیگا

ایک عالم ہے تہہ و بالا فلک کے ہاتھ سے
یہ ہنڈولا ابھی کبھی زیر و زبر ہو جائیگا

وہ شجر ہوں میری قاطع ہو گی سر سبزی مری
شاخ سے جو برگ نکلے گا تبر ہو جائیگا

خاکساری سرمہ ساں شیوہ کریگا تو اگر
دیدۂ اہلِ نظر میں تیرا گھر ہو جائیگا

یاوری طالع کرے تو کیمیا کیا مال ہے
سنگریزہ ہاتھ میں لونگا تو زر ہو جائیگا

غم نہ کھا تجھ سے سوا رزاق کو ہے فکرِ رزق
لاکھ در وا ہونگے گر بند ایک در ہو جائیگا

بعد مردن خوابِ غفلت سے نہ ہو گا ہوشیار
تب خبر ہو گی تجھے جب بے خبر ہو جائیگا

اٹھا ہے پردہ فقط اک نقاب باقی ہے
ابھی مزاج میں کچھ کچھ حجاب باقی ہے

ہوا ہے پھر تجھے الفت کا حوصلہ اے دل
کوئی ستم ابھی خانہ خراب باقی ہے

چھٹا نہیں ابھی سر رشتہ عشقِ کامل کا
ہنوز آرزوئے پیچ و تاب باقی ہے

ہزار شکر چھٹے قیل و قالِ دنیا سے
فقط لحد کا سوال و جواب باقی ہے

ابھی خیال نہ چھوڑوں گا عشق بازی کا
یہی ہیں ولولے جب تک شباب باقی ہے

حلال کر کے وہ کہتا ہے اپنے بسمل سے
تڑپ لے اور اگر اضطراب باقی ہے

جو تم کو آنا ہو جلد آؤ دیکھ لو صورت
فقط دم آنکھوں میں مثلِ حباب باقی ہے

وہ بادہ نوش ہوں ساقی نہ جاؤنگا جب تک
کباب سیخ پہ خم میں شراب باقی ہے
ابھی تو خوب برستے ہیں میکدوں پہ سحاب
چڑھاؤ جام ہوائے شراب باقی ہے
وصال یار ہو کیا بے تکلفی سے رند
مجھے لحاظ ہے اس کو حجاب باقی ہے

ہو کے بیزار عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ
تھوڑے سے رنج کو اتنا نہ بڑھاؤ آؤ
دل نہیں دیتا ہیں اس واسطے آزردہ ہو
روٹھے جاتے ہو اسی بات پہ آؤ آؤ

دونوں زلفیں یار کی ہلتی ہیں نالوں پر مرے
وجد کرتا ہے صدائے نے پہ جوڑا سانپ کا
خط پر آتے ہیں بہت لہرا کے گیسو یار کے
سبزۂ نوخیز پر غش ہے یہ جوڑا سانپ کا

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجکو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

تمہارے ہاتھ سے تنگ آئے ہیں خوں اپنا کرتے ہیں
یہ مجبوری گلے کو کاٹتے ہیں تم پہ مرتے ہیں
نہیں معلوم انھیں کیا حال میری بے قراری کا
غلط کہتے ہیں دم دیتے ہیں جھوٹے ہیں مکرتے ہیں

اشعار متفرق

تمیز ہو تو کرے فرق دوست دشمن میں
خدا نے آنکھیں ہیں دی دیکھ بھال لینے کو
تجھے دیکھے دل جان کھونا پڑا ہے
غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے
اس گل کی بوئے زلف سے تازہ دماغ ہے
عطر گل بہشت ہو تو ہم نہ بو کریں
جانتے ہیں یہ صنم ہم سے ہوا کار ثواب
ہاتھ سے ان کے اگر خون مسلماں ہوئے
صنم سمجھ کے لئے بوسے سنگ اسود کے
گناہ مجھ سے ہوئے ہیں ثواب کے بدلے
سمجھ قبلہ و کعبہ ایک اک کو زاہد
یہ بت سب تراشے ہیں سنگ حرم سے
اللہ کے گھر سے بھی ہے کوئے بتاں عزیز
کعبہ سے بھی زیادہ ہے ہندوستاں عزیز

کعبہ کو جاتا کس لئے ہندوستاں سے ہیں — کس بت میں شہر ہند کے شانِ خدا نہیں

مست کیا جانے کدھر دیر ہے کعبہ ہے کہاں — عمر ساری تری کلالی یہ گزاری ساقی

ٹوٹے بُت مسجد بنی مسمار بتخانہ ہوا — پہلے اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا

کب مٹا عشق کا نشاں دل سے — زخم اچھا ہوا تو داغ رہا

دل کو لے لیتا ہے محبوب جواں ایک نہ ایک — دل ہی رہتا ہے مجھے آفتِ جاں ایک نہ ایک

رُخ کو پوشیدہ عبث یارہ لقا کرتے ہیں — اچھی صورت کو چھپاتے ہیں برا کرتے ہیں

گلے لگائیں بلائیں لیں تم کو پیار کریں — جو بات مانو تو منت ہزار بار کریں

غیر نے لاکھ جوڑ مارے ہیں — پر یہ ہم ان کے ہیں وہ ہمارے ہیں

نگہ یاس سے دیکھوں تو یہ کہتا ہے وہ شوخ — پھر بُری آنکھ سے اس نے مجھے دیکھا دیکھو

بُت کریں آرزو خدائی کی — شان ہے تیری کبریائی کی

یاس دیں کفر میں بھی ملحوظ — بت کو بو جا خدا خدا کر کے

پھبتی او تہرہ وش تجھ کو نہ دہانی چاہیے — چاند بکھرا ہے دو پٹہ آسمانی چاہیے

آزردہ ہو کہ خوش ہو میں کہتا ہوں صاف صاف — ہاں ہاں نہیں پسند تمہاری نہیں مجھے

سالکؔ

نام مرزا قربان علی بیگ وکیل راجہ الور۔ خلف مرزا عالم بیگ خاں تخلص سالکؔ مولد حیدرآباد دکن ساکن دہلی۔ شاگرد مومنؔ و مرزا غالبؔ

تجھ جو روزِ حشر بڑھایا نہ جائے گا — قصہ تمام ہم سے سنایا نہ جائے گا

سیلابِ گریہ گھر کا ہے دشمن اگر تو ہو — کیا اس کے دل میں ہے کہ بتایا نہ جائے گا

حسرت سے اس قدر نہ گراں بار کیجئے — ورنہ مجھے نظر سے گرایا نہ جائے گا

سالک چراغِ پردۂ فانوس کی طرح — سینہ میں داغِ دل کو چھپایا نہ جائے گا

کنج مزار میں بھی وہی اضطراب ہے — دل ہے کہ فرشتہ قہر و عذاب ہے

پہونچے عدو کے گھر میں تو دامن جھٹک دیا — ہم خاک بھی ہوتے ہیں تو مٹی خراب ہے

جتنے گئے ہیں سب ترے غم میں ہیں مبتلا ملکِ عدم یہاں سے زیادہ خراب ہے

گماں مجھ یہ ہے اس کو داد خواہی ہے شہیدکا قیامت ہو گیا حق میں مرے آنا قیامت کا
پسند اللہ کو کیا جانے کیا آجائے اے زاہد مجھے شرمِ گنہ ہے تجھ کو تکبر ہے عبادت کا

ہوتی ہے رحم و نزاکت میں لڑائی کیا کیا سرِ بیمار جو زانو پہ وہ دھر لیتے ہیں
یہ بھی قسمت کہ ہوا نام ہمارا سالک بے نقطہ ہے کہتے ہیں، اگر لیتے ہیں

پوچھتے ہو کہ مجھے غیر کے گھر دیکھا تھا جان کے خوف سے کہہ دیتے ہیں مجبور نہیں
دیکھنا صبحِ شبِ وصل بھی ہے کیا ہی بلا ہیں تو ہیں شمع کے بھی منہ پہ ذرا نور نہیں

وائے اے ضعف کہ سنتے تھے فرشتے اس کو یا سنائی نہیں دیتی مری فریاد مجھے
ہوں وہ خود رفتہ کہ کب جانے کہاں دل کھویا یاد آتا ہے تو اتنا کہ نہیں یاد مجھے

ہے رشک کہ نالہ مرا اور غیر کے گھر جائے ورنہ تمھیں آرام سے یہ رات گزر جائے
ہاں سچ ہے کہ تم کیوں کر اسے قتل کرو گے دشمن کا مرا احساں نہیں کہ اتر جائے

ہنسو بولو کھلے خوبی زباں کی خموشی بات کھولتی ہے وہاں کی
نزاکت سے بڑھا لطفِ شبِ وصل نہیں ہے تاب انھیں خوابِ گراں کی

کچھ ہو پر ان کو جانبِ اغیار دیکھنا اک بار منع کیجئے سو بار دیکھنا
خلقِ خدا پہ رحم بھی کرنا ضرور ہے مت دیکھنا کسی کو خبردار دیکھنا

سجدہ کی نہیں ملتی اگر راہ — آؤ مسجد کی زیارت ہی سہی
وصل اس بت کا نہ ہوگا سالک — آج کی رات عبادت ہی سہی

اشعار متفرق

کس لئے حالِ دلِ گم شدہ یارب کھلا — غیر کا راز تھا کیا یہ بھی کہ افشا نہ ہوا
یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم — جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا
دل وہ کافر ہے کہ مجکو نہ دیا چین کبھی — بے وفا تو بھی اسے لیکے پشیماں ہوگا
تیری تصویر کیوں نہ بول اٹھے — اس میں عاشق کی جان ہے گویا
تیز چلتی ہے سخت جانوں پر — دم نہ چڑھ جائے تیغ قاتل کا
نہیں اک بار بھی سننے کی طاقت دل میں — پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا
اقرارِ وصل اور وہ مستِ غرورِ ناز — آیا ہے پی کے تو کہیں لے نامہ بر شراب
دیکھ لیتے ہیں جو دروازہ کے اکثر باہر — تو نجھے ہاتھ سے کہدیتے ہیں یا ہر باہر
اب تک بھی ہوش میرے ٹھکانے نہیں ہوئے — سالک کا حال رات کو ایسا سنا کہ بس
داورِ روزِ جزا گھبرا گیا — میں نے اتنی حشر میں فریاد کی
صیّاد اور بندِ قفس سے رہا کرے — جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی ہے
وصل کی مانگ نہ یوں دم بدم دُعا — سالک خدا سے اتنا تقاضا نچاہیئے

سحر

نام شیخ امام علی تخلص سحر ولد شیخ محمد امین باشندہ لکھنؤ۔ شروع میں آپ نے ناسخ سے اصلاح لی۔ اس کے بعد آپ برق کو اپنا کلام دکھانے لگے آپ ایک حسین اور بڑے وضعدار اور رنگین مزاج آدمی تھے کپڑا جو پہنتے تھے وہ سر سے پاؤں تک ایک ہی رنگ کا ہوتا تھا یعنی جس کپڑے کی ٹوپی اسی کپڑے کا انگرکھا اسی کپڑے کا پاجامہ یہاں تک کہ جوتی پر بھی اسی رنگ کا کپڑا منڈھوا لیتے تھے۔ مزاج عیش پرستی اور بے پرواہی کی طرف راغب تھا۔ یہاں تک کہ وارستگی نے متروکہ پدری سے بھی دست بردار کرا دیا۔ فرماتے ہیں۔

ترکے کے لئے کون عزیزوں سے لڑے — جیتے ہیں اسد ادھر میں چھوٹے نہ بڑے
باپ آج موا بیٹے کو کل مرنا ہے — دو دن کے لئے کون بکھیڑے میں پڑے

آپ نے امیروں کی ملازمت کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ نواب محمد احسن کے دربار میں کچھ روز ملازمت کی تھی۔ فرماتے ہیں

دام گیسوئے سخن کی یہ کشش ہے اے سحر — ہم سے آزاد اور یوں پابند ہوں دربار کے

ان نواب صاحب کی تعریف میں بڑے قصیدے کہے۔ پھر یہ محبت برہم ہو گئی۔ کچھ دنوں مفلسی میں گزاری۔ آخر کانپور پہونچ گئے۔ فرماتے ہیں۔

قطعہ

جب سے ہم لکھنؤ سے آئے ہیں — بخدا پندرہ اٹھائے ہیں۔
آج تمباکو تک کو پاس نہیں — مفلسی نے دُھرّے اڑائے ہیں

اسی عالم میں کچھ دنوں آپ کاکوری میں۔ کچھ دنوں بلگرام میں اور کچھ دنوں فرخ آباد میں رہے اسی دور میں غدر کا ہنگامہ ختم ہو گیا مگر آپ کو بغیر لکھنؤ چین کہاں تھا۔ آخر چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں کسی گاؤں میں ہیضہ کا شکار ہو گئے اور وہیں مر گئے۔ نہ اس گاؤں کا پتا ہے اور نہ قبر کا نشان

نمونہ کلام

چلے تھے تو مڑ کر ادھر دیکھ لیتے — کہ ہم اور بھی اک نظر دیکھ لیتے
اگر آنکھ میں سات پردے نہ ہوتے — نہ دیکھا تھا جو وہ بشر دیکھ لیتے
کیا کیا غضب دل دیا بے وفا کو — مقدر تھے عیب و ہنر دیکھ لیتے
کسی اور کو آزمانا تھا پہلے — ہمارا بھی دل وقت پر دیکھ لیتے
اگر ترک الفت ہی مدِّ نظر تھا — ذرا آہ کا بھی اثر دیکھ لیتے
کوئی عیب ہے ایسی صورت تو نکلے — کہ عاشق دہان و کمر دیکھ لیتے
نہ تم نے کیا قتل لاغر سمجھ کر — غریبوں کا بھی دل جگر دیکھ لیتے
اگر کھودنا تھا انھیں کھودنا تھا — رقیبوں کو پھر اے سحر دیکھ لیتے

ڈر جائیں گے یہ گل چمنِ روزگار سے
کلیاں جو چھوٹی ہیں نکلتے ہیں لال پر

فرقت نصیبوں کو بھی امیدِ وصال ہے
یہ قاعدہ نہیں کہ کٹے ایک حال پر

باتوں کا لطف ہے نہ مزہ اختلاط کا
عاشق نہ ہو جئے صنمِ خُرد سال پر

اس سے تو نیل بوسہ کا ہوتا تو خوب تھا
کاجل کا تل بناتے ہو کیا گورے گال پر

کھول کر گیسو کو کہتا ہے وہ شوخ
اپنے اپنے دل ذرا پہچان کر

چشمِ میگوں نے انھیں نادم کیا
محتسب دوڑے شرابی جان کر

خوانِ نعمت پر تصرف ہو اگر
دوست کیا دشمن پہ بھی احسان کر

چاہِ ذقن میں لاکھوں یوسف گرے پڑے ہیں
اچھا ثواب لوٹا جس نے کنواں بنایا

رو رو کے پوچھتے ہو حالِ گذشتہ دل کا
مجھ کو حضور والا کیا قصہ خواں بنایا

خط کا آغاز کہیں ہے کہیں رخسار ہے صاف
سہوِ کاتب ہے غلط لکھا ہے قرآن نیا

ہنس کے کچھ بات جو کی دیدئے لاکھوں گویا
ہے ان احسان فراموشوں کا احسان بنا

تڑپا فراق میں دلِ بیتاب اس قدر
سینہ پہ سو جگہ سے گریباں نکل گیا

میں ناتواں مکان سے جب تک کہ اٹھوں اٹھوں
دروازہ سے وہ سروِ خراماں نکل گیا

بغل میں بیٹھ کے دل لے گئے کوئی صاحب
کسی کو ان کی طرف کوئی احتمال بھی نہ ہوا

لیا تو بوسۂ عارض، مگر تصور میں
کہ اپنا کام بھی نکلا ملال بھی نہ ہوا

رہیے میخانہ میں کیا بندۂ احساں ہو کر
رہن رکھ دیجیے خاتم کو سلیماں ہو کر

آپ تشریف نہ لائے نہ ہمیں یاد کیا
رہ گئے دونوں طرف وصل کے ساماں ہو کر

روز جانے میں قدر جاتی ہے — دوسرے تیسرے اُدھر بھی گئے
دو ہی باتوں میں طے کیا قصّہ — بوسہ بھی لے لیا مکر بھی گئے

اشعار متفرق

دنیا میں نام مرد بہ از مرد ہے سحر — یوں مٹیے گور کا بھی نہ باقی نشاں رہے
ہو متانت شعر میں اپنے نہ کیوں کر اے سحر — مدتوں صحبت اٹھائی ناسخِ مغفور کی
رنگین طبیعت ہو تو اتنی تو ہو شوخی — لفظوں سے ٹپکتا ہے سحر رنگ غزل کا
کیا خاک کھلے غیر پہ جالِ دلِ وحشی — خاطر کے غباروں کا بگولا نہیں اٹھتا
وہ اپنے ساتھ کھلائیں تو حاضری دوں میں — دُعا یہ مانگ کہ روزہ فراق میں رکھا
افسوس کوئی مر کر جیتا نہیں دوبارہ — ہوتیں جو لاکھ جانیں تم پر نثار کرتا
دیکھ کر خط کو مسکراتا ہے — نامہ بر حرف آشنا نکلا
ملتے ہیں راستہ میں تو ہوتا ہے یہ کلام — تشریف لایئے گا کسی دن مکان پر
برق کے ہیں ہم دیکھنے والے — ابرِ تر کی ہیں یادگار آنکھیں
چشمِ بیمار کے بیمار مرے جاتے ہیں — لبِ جاں بخش سے ہوتا نہیں اچھا کوئی
وصل کی بعدِ مرگ ٹہری ہے — اس لئے گور پر مسہری ہے

سُلطان

نام خواجہ طالب علی خاں عرف خواجہ سلطان جان۔ تخلص سُلطان خلف خواجہ حسین علی خاں رئیس عظیم آباد مقیم گیا (بہار) آپ کے ننہال کا سلسلہ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔ موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ کافی عرصہ تک کلکتہ میں بھی رہے اور لکھنؤ کی بھی سیر کی ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا ۱۲۷۲ھ میں وفات کی۔ صاحب دیوان ہوئے ہیں؛

کل یہ بستر تھے نیشتر تجھ بن — ایک آفت تھی رات بھر تجھ بن
میرے حق میں تو وہ ہی دوزخ ہے — جاؤں میں خلد میں اگر تجھ بن
کفر کس کا ہے اور کیا اسلام — آپ اپنی نہیں خبر تجھ بن

ہو درختِ امید بار آور ‏ عمر کا کچھ نہیں ثمر تجھ بن
آرہی ہے لبوں پہ جانِ حزیں ‏ دم کا دم میں نہیں اثر تجھ بن
تو ہی ماہ ایک ہمدم ہے ‏ کون لیجائے واں خبر تجھ بن
گرمیں سلطانِ ہفت کشور ہوں ‏ ایک مفلس ہوں سیمبر تجھ بن

راز کیا معلوم ہو تیغِ نگاہِ یار کا ‏ ساحلِ بحرِ فنا ہے گھاٹ اس تلوار کا
موبہ آبِ زمرد سے مری زنجیر ہو ‏ ہوں میں دیوانہ کسی کے سبزۂ رخسار کا
اے بتو ہر مومن و کافر کی لگتی ہے نظر ‏ ہے خدا حافظ تمہارے مصحفِ رخسار کا
بوئے عطرِ خس تھی سلطاںؔ یار کے رومال میں ‏ اس نے جو پونچھا پسینہ سبزۂ رخسار کا

رندوں نے آج نشہ میں کیا دھج نکالی ہے ‏ مینا بغل میں سر پہ سبو جام دوش پر
افتادگی پسند تھی طفلی ہی سے مجھے ‏ آیا نہ ایک دم کبھی آرام دوش پر

اشعار متفرق

تم کو پردیسی فقط بات بنا آتی ہے ‏ یا کبھی چاند سی صورت بھی دکھا آتی ہے
دفن جس کوچہ میں ہم عاشق ناشاد ہوئے ‏ جتنے بے رحم تھے واں غیرتِ فرہاد ہوئے
اک نئی طرح کا ہر حلقے نے پھندا مارا ‏ تو نے اے زلفِ مسلسل مجھے الجھا مارا
دل کی جا سینہ میں میرے اس کا پیکاں رہ گیا ‏ میزباں جاتا رہا اور گھر میں مہماں رہ گیا
کمر لچکی تو وہ بت ہنس کے بولا ‏ بھرا ہے پھولوں سے دامن ہمارا
دیکھے جو ترے چاند کے ٹکڑے سے یہ دو گال ‏ انکار نہ کافر کو رہے شقِ قمر کا
لگائے تیغ اگر قاتل تو شادی مرگ ہو جاؤں ‏ دہانِ زخم میں ہو جائے عالم روئے خنداں کا
مانی ملیں گی خاک میں سب موشگافیاں ‏ اسکی کمر میں فرق اگر بال بھر رہا
ان دلوں حسن پر آپ اپنے ہیں مغرور بہت ‏ اور سب باتیں تو موقوف ہیں چل دور بہت
بات کہتے نہیں ہیں موتی پروتے ہیں ہم ‏ ہے بجا کہیئے زباں کو جو زبانِ الماس

مرنے کے بعد بھی نہ گئیں بے قراریاں — عالم ہے برق کا مرے سنگِ مزار پر
لڑتا ہے وہ اپنی عکس سے آئینہ میں آنکھیں — مری نظروں میں اے سلطاںؔ ہرن گویا کہ لڑتے ہیں
جب آتا ہوں ہو جاتا ہے سوراخ جگر میں — کاہے کو کوئی آئے گا اب آپ کے گھر میں
چاہیئے عاشق و معشوق میں گرما گرمی — وصل کی رات نہیں خوب یہ شرما شرمی
دامِ بلائے عشق میں ہم بے سبب پڑے — کم بخت دل پہ ہائے خدا کا غضب پڑے
تاب کس کی جو کرے بات اس بتِ مغرور سے — حور بھی دیکھے تو لے اس کی بلائیں دور سے
معشوق کو جو وصل کی شب میں حجاب ہے — دامن میں ساعقہ کے گل آفتاب ہے
پڑھی جو بادہ کشوں نے نمازِ استسقا — تو جھوم کر طرفِ قبلہ سے گھٹا آئی

سلیمان

نام مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر تخلص سلیمانؔ خلف جناب شاہ عالم بادشاہ شاگرد شاہ حاتم و سید انشاؔ۔ آپ مدتوں لکھنؤ میں جلوہ افروز رہے۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر آباد میں قضا کی اور وہیں مدفون ہوئے۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

غم سے ہو کر برق وش تڑپا تڑپ کر رہ گیا — بس مرا سینہ میں دل دھڑکا دھڑک کر رہ گیا
ہم نے جانا آپ آئے ہو جو کچھ کھڑکا ہوا — یاد سے دیکھا تو در کھڑکا کھڑک کر رہ گیا
توڑ کرنا گر تجھے منظور تھا تو کس لئے — ہنچے کو میاں میں سٹر کا سٹرک کر رہ گیا
طائرِ دل کو ہوا کیا اس قفس کی قید سے — چھوڑ کر طفلِ چمن پھڑ کا پھڑک کر رہ گیا
اے سلیمانؔ عشق کی آتش سے مجھ دل میں پڑی — آگ کا شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا۔

شیخ کی تسبیح اور عمامہ کس گنتی میں ہے — وہ کمندِ زور ہے یہ گنبدِ تلبیس ہے
دل اگر فولاد ہو تو کھنچا جاتا ہے آہ — اس صنم کا جذبِ الفت سنگِ مقناطیس ہے،

اشعار متفرق

کرے یہ کاش فلک سرے بند بند جدا — یہ مجھ سے ہو نا مرا شوخِ خود پسند جدا
جنازہ تیرے دیوانے کا اس تو قبر سے اٹھا — کہ شورِ نالہ ہر اک خانۂ زنجیر سے اٹھا

ناز سے کرکے وہ ایسا ہی اشارہ چمکا ‏— کہ نئے سر سے یہ پھر داغ ہمارا چمکا

لبوں پہ آکے جو نالہ نہ ہٹ گیا ہوتا ‏— تو آسمان وزمیں سب الٹ گیا ہوتا

رہ گئے ہوش وحواس وخرد وطاقت سب ‏— یوں ترے کوچہ سے ہیں لے سرو ساماں نکلا

جان دی راہِ محبت میں الٰہی صد شکر ‏— بات جو ہم نے کہی تھی سو نبھا ہی صد شکر

بات کہنے میں جواب نامہ لایا، سچ بتا ‏— کیا نکالے تو نے اب اے قاصدِ چالاک پر

زخم کھاکر جو گرا میں تو وہ یہ کہنے لگا ‏— اچھا اچھا تو تڑپ کر مری تلوار کو توڑ

ہزار طرح سے وہ چہچہے کرے لیکن ‏— نہ پہنچے نالے کو میرے ترانۂ بلبل

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس ‏— اک برچھی ہے جو پہلو میں چبھو دیتے ہو

کیا اجابت کی ہو اور کو خداوندا آہ ‏— ماری ماری جو دعائے سحری پھرتی ہے

جبہہ سائی کا نشاں جائے جبیں سے کیونکر ‏— کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتا ہے

سودا

نام مرزا محمد رفیع تخلص سودا۔ ولد مرزا محمد شفیع۔ آپ کے بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ آپ کے والد ایک مالدار آدمی تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں کابل سے ہندوستان آئے تھے اور آخر یہیں کے ہو رہے۔ مرزا سودا ۱۷۱۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں تربیت پائی۔ اور شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ والد کی وفات کے بعد تمام دولت اڑا چکے تو فوج میں سپاہی ہو گئے۔ اور آپ کی شاعری کی گھر میں دھوم مچ گئی اور شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے آپ کو دینے لگے۔ جب شاہ عالم کا کھیل بگڑ گیا تو فرخ آباد آ گئے اور نواب احمد علی خاں جنگ یار کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ برداشتہ خاطر ہو کر فیض آباد چلے آئے۔ نواب شجاع الدولہ بر سر حکومت تھے وہ بہت اعزاز سے آپ سے ملے اور آپ کی تنخواہ مقرر کر دی۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔ فیض آباد میں آصف الدولہ کا جی نہ لگا اور لکھنؤ چلے آئے۔ اور اسی کو مرکز حکومت قرار دیا۔ مرزا سودا بھی لکھنؤ آ گئے اور آصف الدولہ

سودا صاحب کو زندگی بھر چھ ہزار روپیہ سالانہ بطور وظیفہ دیتے رہے۔ ۱۷۸۱ء میں وہیں انتقال کیا اور آغا باقر کے امام باڑہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کو قصائد کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ہجو کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ کو ہر قسم کی زبان پر دسترس حاصل تھی۔

معذور نہیں اس کی تجلّی بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر حرفِ زباں کا

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمعِ حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سودا جو کبھی گوش سے ہمّت کی سنے تو
مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

دل مت ٹپک کہ اٹھایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائیگا

رخصت اے اغباں کہ ٹک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائیگا

پہونچیں گے اس چمن سے نہ ہم داد کو کبھی
جوں گل یہ چاکِ جیب سلایا نہ جائیگا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا

ظالم میں کہہ رہا تھا کہ اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائیگا

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے

قابل ہمارے عشق کو تشہیر دے ضرور
آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے

فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

تنہا نہ روزِ ہجر ہے سودا پہ یہ ستم
پروانہ ساں وصال کی ہر شب جلا کرے

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے خدا جانیے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلّی کو مری ایک نظر بھی

تنہا مرے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاکِ گریبانِ سحر بھی

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا
ہونی جو کچھ تھی قبلۂ حاجات ہو گئی

مستی سے اس نگاہ کی لے محتسب خبر
دنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی

یارو وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا
نظروں میں سو طرح کی حکایات ہو گئی

کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے
تھا طفلی میں گہوارا مرا دامنِ غم سے

یہ رنگ میں تصویر کی تیرے ہے نزاکت
جس کو نہ کوئی دیکھ سکا دیدۂ غم سے

کیا چیز ہے وہ دل جسے کہتے ہیں الٰہی
اک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہے

دشنام تو دینے کی قسم کھائی ہے لیکن
جب دیکھے ہے وہ مجکو اک جنبشِ لب ہے

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

انصاف کس کو سونپئے اپنا بجز خدا
منصف جو بولتے ہیں سو تجھ سے ڈرے ہوئے

ٹوٹے تری نگاہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہو شراب کا

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

سوداؔ نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرّہ میں ہے آفتاب کا

ہر شے میں سمجھ تو ظہور کس کا ہے
شرر میں روشنی شعلہ میں نور کس کا ہے

دماغ خلق پُر از کبر ہے میں حیراں ہوں
یہ مشتِ خاک میں اتنا غرور کس کا ہے

اشعارِ متفرق

محبتوں کا نہ کرو غیر کی مجھ سے اخفا
کون سی شب تھی کہ میں واں نہیں دیوانہ تھا

بدنام تو عبث مجھے کرتا ہے ناصحا
مدّت ہوئی بتوں سے سروکار اٹھ گیا

طلب نہ چرخ سے کر نانِ راحت اے سودا
پھرے ہے آپ یہ کاسہ لئے گدائی کا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

بھٹکی پھرے ہے کب سے خدایا مری دُعا
دروازہ کیا قبول کا معمور ہو گیا

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

ہندو ہیں بُت پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اسی کو جو ہے آشنا پرست

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلائے شیخ
تو مجھے گبر کہے گبر مسلماں مجھ کو

ہے رنگِ تماشائے جہاں صورتِ خورشید
جو صبح کو دیکھا وہ نظر شام نہ آیا

گزری جس غم سے ہمیں زندگیِ دو روزہ
دیکھے اس غم کو خدا ماہِ محرّم سے دور

لے مرے دل کو دے کے اپنا دِل
سنگ کے مول یہ بکے ہے لعل

جگر ان کا ہے جو تجھ کو صنم کہہ یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں

صفحۂ ہستی پہ اک حرفِ غلط ہوں سودا
جب مجھے دیکھنے بیٹھو تو اٹھا جاتا ہوں

ہاتھ کس کا ہے تری زلف کا شانہ سچ کہہ
رات آئے ہیں نظر خواب پریشاں مجکو

اسرارِ خرابات سے واقف جو ہو زاہد
کعبہ سے نہ کم سمجھے درِ پیرِ مغاں کو

سوز

نام مولوی عبدالکریم تخلص سوز۔ خلف مولوی امام بخش صہبائی۔ آپ پُرانی دلی محلہ قراول پور کے رہنے والے تھے۔ پہلے آپ کا تخلص میر تھا۔ مگر جب اس تخلص سے میر تقی میر نے شہرت پائی تو آپ نے اسے بدل کر سوز اختیار کر لیا اک شعر میں اس کا اشارہ بھی کر دیا۔

جب وہ کہتے تھے میر میر تب نہ ہوتے تھے ہزار حیف
اب کہے ہے سوز سوز یعنی بڑے جلا کرو

آپ کے شعر پڑھنے کا انداز بھی عجیب و غریب تھا جب آپ شعر پڑھتے تھے

تو شعر کے مضمون کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ یعنی اگر کسی شعر میں مرنے کا مضمون بندھا ہوا ہے تو آپ لیٹ جاتے تھے اور مردہ بن جاتے تھے۔ آپ سے ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی مشاعرہ میں ایک صاحب نے آپ سے کہا کہ حضرت آپ کا تخلص کیا ہے تو فرمایا کہ اس حقیر نے پہلے میر تخلص اختیار کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ لہذا اس خیال سے کہ ان کے سامنے میرا چراغ کیا چلے گا۔ میں نے سوز تخلص اختیار کیا ہے پھر اس شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سنا ہے آپ گوز تخلص اختیار کرتے ہیں۔ اس پر مشاعرے میں بڑا قہقہہ پڑا۔

قطعات

مجھی سے تجھے بے وفائی تھی کرنی — میں تجکو تو اہل وفا جانتا تھا
ولے گرم جوشی سے تھا دل کو خطرہ — کہ آخر کرے گا دغا جانتا تھا
دغا کھائی آخر دغا کھائی آخر — میں کیا جانتا تھا میں کیا جانتا تھا

سنبھال اپنی زباں او بے ادب سوز — یہ کیا بولا ہے کہ کاٹوں اس زباں کو
کوئی محبوب کو دیتا ہے طعنہ — کریں گو قتل وے سارے جہاں کو
یہ وہ ہیں اپنے گر یاں یہ آ دیں — او لٹ ڈالیں زمین و آسماں کو

کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہو گا — تمہارے ساتھ جو میں نے وفا کی
گریباں میں کبھی انصاف سے دیکھو — کہ تو نے اس وفا پر مجھ سے کیا کی
لگا کہنے کہ بس بس چونچ کر بند — وفا لایا ہے، دُت تیری وفا کی

دیا تھا میں نے دل اس بے وفا کو پانچ بوسوں پر — کئی دن تک تو مانگا اس نے پھر تو رو ڈالا ہے
کہا کل کے دل تو پھیر دے تو یوں لگا کہنے — تقاضے نے ترے ہر دم کے مجکو مار ڈالا ہے

پڑا ہوگا کسی کونے میں جا پہچان کر لے جا — مرا دل دو مرا دل دو نیا نخرہ نکالا ہے

بوقت نزع بولا سوز رو کر — سنا کر اپنے سب خرد و کلاں کو
سبھاکے صاحبو صاحب سلامت — چلے سیدھے ہم دار الاماں کو
یہ اپنا جھونپڑا دکھ اے پڑوسن — نہ جاویں کیا کریں دیکھا جہاں کو

ایک نے سوز سے پوچھا کہ صنم سے اپنے — اب بھی ملتے ہو بدستور کہ گاہے گاہے
دیکھ کر منھ کو گھڑی ایک میں بھر کر دم سرد — یوں اشاروں سے بتایا سر راہے گاہے

کل اس طرف سے گزرا ستمگر — میں نے کہا کیوں میں آؤں ہمراہ
جھنجھلا کے تب وہ بولا مجھ سے — میں کون تو کون اے واہ اے واہ

چلتر سن نیا عیار کا تو — زبردستی سے میرا دل لیا ہے
چھپا مٹھی میں کہتا ہے کہ او میاں — ہمارے ہاتھ میں بوجھو تو کیا ہے

عدم سے زندگی لائی تھی پھسلا — کہ دنیا خوب جا اچھی فضا کی
جنازہ دیکھتے ہی دل یہ بولا — دغا کی رے دغا کی رے دغا کی

ولے کیا آن تھی اللہ اللہ — جس غرہ پہ چھاتی پہ چڑھا تھا
وہ مجکو ذبح کرتا تھا چھری سے — میں اس کی تیز دستی دیکھتا تھا

جا کر کہا کسی نے کہ لو سوز تو موا — کہنے لگا کہ بنڈ تو چھوٹا بھلا ہوا
پر اتنی بات سنتے ہی رو کر کہا کہ حیف — تو تا ہمارا اڑ گیا کیا بولتا ہوا

غزلیات

تا درِ کوئے صنم یا تو مجھے پہونچا دو — یا ابھی دل کو مرے پاس سے اس کے لادو
رسم و آئینِ اسیری کے مجھے یاد نہیں — تو گرفتار ہوں اے ہم قفسو سکھلا دو
سانس لینے دو چھری نیچے شتابی کیا ہے — ذبح تو کرتے ہو ٹک صبر کرو جلا دو
مغبچو اور توقع تو نہیں تم سے اب — آتشِ عشق تو دامن سے بھلا بھڑکا دو
درد اور سوز سے دنیا میں غریبوں کی بساط — شاعری تم کو مبارک یہ رہے استادو

ہمارے پاس بھی گلہ ہے یہ گلہ ہے آئیے صاحب — نہیں کچھ راہ ملنے کی مجھے بتلائیے صاحب
کسی کے لینے دینے میں نہیں کونے میں بیٹھے ہیں — تمہارا غم ستاتا ہے اسے سمجھائیے صاحب
پڑے تھے دل کے پیچھے سو تو اسکو لے چکے اب کیا — اگر یہ جان بھی درکار ہے لیجائیے صاحب
یہ لیکر جان بھی اللہ اکبر تم ہوئے رخصت — تمہارا کام پورا ہو چکا اب جائیے صاحب
قیامت تک رہے گی کہنے سننے کو وفا تیری — کھڑے رہ کر بھلا اس سوز کو گڑوائیے صاحب

قضارا وہ قاتل اِدھر آن نکلا — تو لینے کو اس کے مرا جان نکلا
کھڑا العطش پر ہو کے بولا کہ ہے ہے — یہ کشتہ تو کچھ جان پہچان نکلا
بھلا سوز ایسا بتا جس کی خاطر — یہ خورشید پھاڑے گریباں نکلا

اشعار متفرق

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو — راہ ملتی نہیں دشت کے آواروں کو
دامن تلک تو تیرے کہاں دسترس مجھے — تیری گلی کی خاک بھی ہو تو بس مجھے
اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے — دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے
مر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے — سبھو سے پوچھتا ہے کس نے اس کو مار ڈالا ہے
جس کے نالے پہونچتے ہیں مجھ تک — کاش میں ان کا نامہ بر ہوتا
کیا خفا کر دیا جوانی کو — کوسوں کس منہ سے ناتوانی کو
کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند — جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

شہیدی

نام کرامت علی خاں تخلص شہیدی۔ شاگرد جناب مصحفی و شاہ نصیر۔ آپ نے میرا ور سودا کا زمانہ بھی دیکھا ہے وہ خود فرماتے ہیں۔

سودا سے اس نے لی ہے شکر میرے نمک ... ہے طرفہ تر زباں میں شہیدی کی چاشنی

آپ ہڑیہ پور وہ ضلع اونام کے تھے مگر بالنس بریلی میں رہتے تھے۔ آپ بڑے عروضی اور حساب داں تھے۔ پنجاب۔ گجرات۔ رام پور۔ لکھنؤ دہلی وغیرہ میں بھی رہے ہیں سنہ ۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء میں حج کے لئے روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ ادا کرنے کے بعد جب آپ مدینہ منورہ پہونچے تو وہیں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی آپ کا سن وفات سنہ ۱۲۵۶ھ ہے۔

عاشقوں پر اس قدر ظلم و ستم اچھا نہیں ... دیکھ اے ظالم کہے دیتے ہیں ہم اچھا نہیں

دیکھ کر مجکو چراغِ صبح دم بولی قضا ... حق میں اس بیمار کے عیسا کا دم اچھا نہیں

آئیگی زنداں پہ کیا آفت کہ مجکو دیکھ کر ... سب اسیروں نے کہا اس کا قدم اچھا نہیں

کی ہے وحشت کے دلوں میں ہم نے اک عالم کی سیر ... یار کے کوچے سے کچھ باغِ ارم اچھا نہیں

رفتہ رفتہ راہ و رسمِ دوستی کم ہو تو خوب ... ترک کرنی خط کتابت ایک دم اچھا نہیں

رحم آتا ہے تجھے اس نوجوانی پر تری ... اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

رات سوتا تھا جو وہ رشکِ قمر کوٹھے پر ... چاندنی چھٹکی رہی تا بہ سحر کوٹھے پر

جھانکنا روزنِ دیوار سے اب چھوڑ دیا ... یا کھڑے رہتے تھے دو دو پہر کوٹھے پر

اب کی گرمی نے کیا خلق کو یہ زیر و زبر ... دن کو تہ خانے میں شب کو اگر کوٹھے پر

دیکھ کر ایک جبل پر جیسے حیراں تھا کلیم ... شام کے وقت وہی نور ہے ہر کوٹھے پر

غیر کیسے ہی لپسے زینہ کو میں جا پہونچا ... پاؤں جھٹ روزنِ دیوار پہ دھر کوٹھے پر

بزم میں ان کی طرف میں نے جو دیکھا کل رات
کس ادا سے ہوئے مجھ پر وہ خفا آنکھوں میں

مجھ سے کیا پوچھتے ہو کیوں ہیں تری آنکھیں سرخ
بادۂ خونِ جگر کا ہے نشا آنکھوں میں

کیا ملاحت رخِ جاناں میں ہے اللہ اللہ
آگیا جس کے تصور سے مزا آنکھوں میں

مردمِ دیدہ کو ہے خلعتِ زر کی خواہش
جلوہ فرما ہو تو اے مہر لقا آنکھوں میں

ایک عشوہ میں کیا اس نے شہیدی کو شہید
خنجر و تیغ ہی بھر رکھے تھے کیا آنکھوں میں

لاشۂ مجنوں کے گرد آکر غزال
سرنگوں بیٹھے تھے ماتم دار سے

دامنِ قاتل کو دوڑاتا ہوں ہاتھ
شوق ہے کیا زخمِ دامن دار سے

دل میں آتش سی بھڑک اٹھتی ہے آہ
دیکھ کر عارض ترے گلنار سے

نقشِ پا نقشِ پری بن جائیں گے
ٹپکی سرخی گر یونہی رفتار سے

اے شہیدی سوئے جنت ہے رواں
راہ سیدھی کوچۂ دلدار سے

شوقِ وصال سینہ میں آزار بن گیا
میں خواہشِ طبیب میں بیمار بن گیا

سمجھا گناہ کو جو گناہ اپنی شرع میں
اس پر عذاب ہے کہ گنہگار بن گیا

رسوا شہیدی آپ ہوا اس کی بزم میں
کم عقل منہ لگاتے ہی بس یار بن گیا

آفتابِ حشر پہ کالی گھٹا سی چھا گئی
آہ یہ کس روسیہ کا نامۂ اعمال ہے

طیش میں آکر بھبھوکا کس لیے بنتا ہے تو
آپ ہی قاتل رخِ گل رنگ تیرا لال ہے

دورِ عالم میں مقدم کیوں نہ سمجھیں غم کو ہم
اے شہیدی ماہِ ماتم سے شروعِ سال ہے

دلجوئیِ عشاق کی فرصت نہیں ملتی
یا ناز سے اپنے تمہیں رخصت نہیں ملتی

دیتا ہے اگر زہر ملا دے شکر اس میں
بے زہر شکر میں مجھے لذت نہیں ملتی

ناکامیِ جاوید کی ہم مانگتے منت
افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

نظم "جنازہ نامہ" کے چند بند

تا زیست نہ غم گو دلِ مغموم سے نکلے
یوں کاش گرہ خاطرِ محروم سے نکلے
دم جب اس ارماں بھرے مظلوم سے نکلے
پھر ہو کہ لبِ قاتلِ معصوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

کوثر سے منگا پانی اسے غسل دِلاؤ
اور حلّہ جنّت سے کفن بریں پہناؤ!
شاخِ شجرِ سدرہ سے گہوارا بناؤ
کاندھوں پہ فرشتوں کے اسے رکھ کے اٹھاؤ
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

گر سولنے کے سہرے سے مزیّن ہو سر بانہ
موتی لگا کنگن کسی تختہ سے بندھانا
آج مبارک تمھیں نوبت کا بجانا
ہوتا چلے شہنائیوں میں راگ شہانہ
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

حوریں لئے ہاتھوں میں جیوڑ لاکھوں مرصّع
میّت کے چلیں سنگ اٹھائے ہوئے برقع
سر پیٹتی اپنا چلے کوئی پھاڑ کے مقنع
خوش دل کوئی گاتا چلے تا قبر یہ مصرع
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس کشتۂ بے جرم کا قاتل ہو جو ہم سا
یارب لبِ ہے تربت پہ کھلا باغِ ارم سا
تعظیم میں یہ فقرہ ہو بیتِ حرم سا
ہر عرس پڑھا جائے شہیدی کا یہ خمسا
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

شیفتہ

نواب محمد حاجی محمد مصطفےٰ خاں بہادر متخلص شیفتہ۔ خلف عظیم الدولہ نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ۔ باشندہ دہلی۔ پیدائش ۱۸۰۶ء۔ شاگرد مومن خاں مومنؔ۔ آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی شاعری میں حسرتی تخلص فرماتے تھے۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں اور بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

۱۸۶۹ء میں وفات کی۔

گر نہیں یہ، کہ برتتا ہے وہ ظاہرداری
کیوں نگاہِ غلط انداز ادھر کرتا ہے
دیکھئے آہ ہماری بھی اثر کرتی ہے
سخنِ درد سُنا ہے کہ اثر کرتا ہے
ایک دن شام ہماری بھی سحر کردے گا
وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے
بدگماں آپ غلط محرمِ اسرار سے ہیں
دل ہمیں رازِ نہانی کی خبر کرتا ہے

خجل ہوں آپ ہیں بے وقت کے آنے سے
تم اور کرتے ہو ہنس ہنس کے شرمسار مجھے
جفا کو ترک کرو تم وفا کو میں چھوڑوں
کچھ اشتہار تمہیں ہو کچھ اشتہار مجھے
بڑے فساد اٹھیں شیفتہ خدا نہ کرے
کہ ان کی بزم میں ہو دخلِ اختیار مجھے

گئے ہم سے خفا وہ ہیں گئے ان سے خفا ہم
مدت سے اسی طرح نبھی جاتی ہے باہم
نہ طبع پریشاں تھی نہ خاطر متفرق
وہ دن بھی عجب تھے کہ ہم اور آپ تھے باہم
کیا کرتے ہیں کیا سنتے ہیں کیا دیکھتے ہیں ہائے
اس شوخ کے جب کھولتے ہیں بندِ قبا ہم

تھا غیر کا جو رنجِ جدائی تمام شب
نیند ان کو میرے ساتھ نہ آئی تمام شب
یہ ڈر رہا کہ سوتے نہ پائیں کہیں مجھے
وعدہ کی رات نیند نہ آئی تمام شب
تھوڑا سا میرے حال پہ فرلکے التفات
کرتے رہے وہ اپنی بڑائی تمام شب

خیر جو گزری سو گزری پر یہی اچھا ہوا
خط دیا تھا نامہ بر نے ان کو تنہا دیکھ کر
ہیں تو دونوں سخت لیکن کون سا ہے سخت تر
اپنے دل کو دیکھئے میرا کلیجہ دیکھ کر
التماسِ وصل پر بگڑی تھی بے ڈھب رات کو
کچھ نہ بن آئی مگر جوشِ تمنا دیکھ کر

میں نے کیا جانیے کس ذوق سے دی جاں دمِ قتل
کہ بہت اس سے ستمگر کو پشیماں دیکھا
کون کہتا ہے کہ ظلمت میں کم آتا ہے نظر
جو نہ دیکھا تھا سو ہم نے شبِ ہجراں دیکھا

خوبیِ بخت کہ، پیمانِ عدو — ان کو ہنگامِ قسم یاد آیا
کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی تازہ ستم یاد آیا

یاس سے آنکھ جو جھپکی تو توقع سے کھلی — صبح تلک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
شبِ ہجراں نے کہا قصّۂ گیسوئے دراز — شیفتہ تو کبھی دلِ زار نے سونے نہ دیا

جی داغِ غمِ اشک سے جل جائے تو اچھا — ارمان عدو کا بھی نکل جائے تو اچھا
پروانہ بنا میرے جلانے کو وفادار — محفل میں کوئی شمع بدل جائے تو اچھا

سب باتیں انھیں کی ہیں یہ سچ بولیو قاصد — کچھ اپنی طرف سے تو تصرّف نہیں کرتا
کیا حال تمہارا ہے ہمیں بھی تو بتاؤ — بے وجہ شیفتہ کوئی اُف اُف نہیں کرتا

شرماتے اسقدر رہے کیوں آپ رات کو — مدّت میں گو ملے تھے مگر میں نیا نہ تھا
کل شیفتہ سحر کو عجب حال خوش میں تھے — آنکھوں میں نشّہ اور لبوں پر ترانہ تھا

کہتے ہیں بے وفا جھ میں نے جو یہ کہا — مرتے رہیں گے آپ جیتے ہیں جب تلک
مایوس لطف سے نہ کرائے دشمنی شعار — امید سے اٹھاتے ہیں ہم جور اب تلک

شیشہ اتار شکوے کو بالائے طاق رکھ — کیا اعتبار زندگیِ بے ثبات کا
اے مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو — رکھا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا

اشعار متفرق

اس شوخ کج ادا سے نہ آئی موافقت — کیوں کر گلہ نہ ہو مجھے طبعِ سلیم کا
اس سے میں شکوہ کی جا شکرِ ستم کر آیا — کیا کروں تھا جو مرے دل میں زباں پر آیا

گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے
دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا
غیر ہی چاہیں گے اب اے شیفتہ
کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا

صبا

نام وزیر علی تخلص صبا۔ آپ لکھنؤ کے باشندے تھے علوم رسمیہ سے آگاہ تھے شعر وسخن سے خداداد مناسبت تھی خواجہ حیدر علی آتش کی صحبت سے شاعری میں اور بھی مشاق ہو گئے۔ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشت خاک کے
عاشقوں سے یہ حجاب اچھا نہیں
بیچ سے پردے اٹھا افلاک کے
آدمی دعوئ انا الحق کا کرے
ولولے دیکھو تو مشت خاک کے
پھوٹ نکلا رنگ جسم یار کا
پھول بوٹے بن گئے پوشاک کے
توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو
کھول دے پر طائر ادراک کے
اہل دنیا کے نہ بہکانے پہ جا
غول ہیں صحرائے وحشت ناک کے
خاکساروں سے نہ کر پہلو تہی
ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے
ہے رگ ابر بہاری اے صبا
ڈورے اپنے دیدۂ غمناک کے

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے
ہم سے اور ایسی برائی دیکھئے
بات پھر ہم سے بنائی دیکھئے
پھر وہی تقریر آئی دیکھئے
آئینہ اس بت نے دکھلا کر کہا
اور صورت ہاتھ آئی دیکھئے
ہم اسیران طلسم خاک ہیں
کیا ہوتا وقت رہائی دیکھئے
مار ڈالا منھ چھپا کر آپ نے
موت کس پردے میں آئی دیکھئے
میری جانب یوں نظر کرنی نہ تھی
آپ نے بجلی گرائی دیکھئے
مر گئے لیکن نہ راز دل کھلا
آہ بھی لب تک نہ آئی دیکھئے
وہ نہ آنا تھا نہ آیا اے صبا
رفتہ رفتہ موت آئی دیکھئے

مرتے دم اے بے وفا دیکھا تجھے | اک نظر دیکھا تو کیا دیکھا تجھے
اے پریرو میں دوانہ کیوں نہ ہوں | بال کھولے بارہا دیکھا تجھے
گریۂ بلبل پہ اس نے ہنس دیا | جس نے اے گلگوں قبا دیکھا تجھے
مارے غیرت کے نہ نکلا آفتاب | بام پر جب جلوہ نما دیکھا تجھے
دید میں ہر چند ہے نقصانِ جاں | فائدہ اتنا ہوا دیکھا تجھے
بوئے گلشن بھی نہ لائی تا قفس | بس ہوا ہو اے صبا دیکھا تجھے

قاصد الا دے خبر یار کے آجانے کی | جان جاتی ہے چلی ہجر میں دلوانے کی
آپ آئے نہ کبھی خط نہ کتابت بھیجی | سینکڑوں راہ دکھائی ہمیں ترسانے کی
چشم گریاں ہے سدا سینہ بھی بریاں ہے مدام | آرزو جی میں ہے بس جی سے گزر جانے کی
تو ملے غیروں سے آنکھوں سے میں اپنی دیکھوں | حیف صد حیف کہ بس جائے ہے مر جانے کی
گریہ زاری پہ مری رحم نہیں آئے گا | جب تلک چشم مری خون نہیں برسانے کی
اے صبا بہر خدا کچھ مجھے تدبیر بتا | یا اسے لاکے ملا یا مجھے پہچانے کی

جو سونگھے اس گل زیبا کے پیرہن کی بو | خوش آوے کب اسے نسرین و نسترن کی بو
دماغ کیوں نہ معطر ہو بلبل شیدا | ہر اک گل سے جو آتی ہے پنجتن کی بو
خط آگیا ترے چہرے پہ اے گل خنداں | گئی مزاج سے اب تک نہ بالے پن کی بو
جو بیٹھا آن کے محفل میں وہ مرا گلرو | گئی وہ مست اسی وقت انجمن کی بو
نشانی جب تری زلفوں کی لے گئی ہے صبا | حنا سے جاتی رہی نافۂ ختن کی بو

جمشید اپنے وقت کا ہوں میں فقیر مست | جام جہاں نما ہے پیالہ سفال کا
کولھوں میں گردشِ نگہہ یار سے پسا | تل تیلی ہو کے بہہ گیا چشم غزال کا

کیا بنایا ہے بتوں نے مجھ کو　　نام رکھا ہے مسلماں میرا
اب تو صاحب کی ہوئی خاطر جمع　　سُن چکے حال پریشاں میرا

دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج　　پیدا کیا ہے مجکو خدا نے برائے رنج
آدم سے باغِ خلد چھٹا مجھ سے کوئے یار　　وہ ابتدائے رنج تھی یہ انتہائے رنج

مردے پڑے ہیں ہجر کے مارے پلنگ پر　　تابوت کا گماں ہے ہمارے پلنگ پر
کروٹ بدل کے آپ جو سوئے ہیں وصل میں　　ہم لگ گئے ہیں گور کنارے پلنگ پر

نہ کیوں کیفیتِ اشراق ہم مستوں کو حاصل ہو　　ہر اک خُم اپنے میخانے میں سینہ ہے فلاطوں کا
بلند و پست عالم ایک ہے چشمِ حقیقت میں　　حصیرِ فقر ہم پایہ بنا تختِ فریدوں کا

اشعار متفرق

آسماں نے مجھے محرومِ شہادت رکھا　　تیغِ قاتل کے لئے بختِ سیاہ ڈھال ہوا
روتے روتے چشم نابینا ہوئی　　یہ کنواں ٹوٹا تو اندھا ہو گیا
ہو گیا قتل ان کا نام لیکر پیارے　　مجھ کو سیفی یار کا اسم جمالی ہو گیا
لے گیا چھین کے دل وہ بتِ پُرفن کیسا　　رہ گئے دیکھ کے منھ شیخ و برہمن کیسا
اس بادشاہِ حسن کا سایہ جو پڑ گیا　　ہر سروِ لنگ باغ میں تیمور ہو گیا
جو دِ تاپیں عشقِ گل خوف خزاں ایذائے خار　　لاکھ آفت میں پھنسی ہے ایک جانِ عندلیب
کس کے وعدہ کا رہ رہ کے خیال آتا ہے　　اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں روح
کھائیں گے زہر ان کے خطِ سبز فام پر　　سرسبز ہوں گے خضر علیہ السلام پر
مجھے بھی اور اسے بھی امتحاں کا اک بہانہ ہے　　اسے تیغ آزمانی ہے مجھے دل آزمانہ ہے
تجربہ دلوں کی جانبازی کا کر دم قتل　　امتحاں غیر کا میرا سرِ میداں ہو جائے

صفیر

نام سیّد فرزند احمد تخلص صفیر خلف سیّد احمد احمد (داروغہ آبکاری انگریز) باشندہ بلگرام مقیم شاہ آباد۔ آپ اردو میں محمد مہدی خبر بلگرامی داماں علی سحر سے کلام پر اصلاح لیتے تھے فارسی زبان میں مرزا غالب اور مرثیہ میں دبیر سے اصلاح لیتے تھے۔ صاحبِ دیوان اور دوسری ادبی کتب کے مصنّف ہوئے ہیں۔ "تذکرہ جلوۂ خضر" آپ کی نایاب ادبی تصنیف ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اس تذکرہ میں استاد شاعروں اور ان کے تلامذہ کا مفصل طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں جلدیں ۱۸۸۵ء ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی ہیں۔ اسی دوران آپ کا انتقال ہوا۔

وصل میں پہلے تیور بدلے پھر اس نے آرام کیا
فوجِ مژہ تو پھرا بانٹا تیغِ نگاہ کونسیام کیا

سنکر میرے عشق کا چرچا کہنے لگا وہ پیس کے دانت
نام نہ نکلے اس کا الٰہی جس نے مجھے بدنام کیا

گھر سے جو نکلے وحشت میں ہم ساتھ تھا خضرِ دل بنا
سیدھے تیرے در پر پہونچے پھر نہ کہیں پہ قیام کیا

ختم چلن ہے پاؤں پہ تیرے باغ پسا ہے مثلِ حنا
چال کرے کیا سرو کہ جس نے ایک قدم نہ خرام کیا

بسکہ ہمارا ذکر تھا سب میں یار کی جھکی تیغِ نگاہ
خاص ہماری ضد سے اس نے آج یہ قتلِ عام کیا

رب ہے تو ہم بندے ہیں تیرے، ملّت کیسی مذہب کیا
کفر ہے کس گنتی میں جہاں پر ہم نے ترکِ اسلام کیا

میری پیری تیری جوانی کیسی ہے، اندھیر کی بات
مجکو چراغِ صبح بنایا تجھ کو چراغِ شام کیا

بزم میں اس سے کہتے کچھ ہم لوگ برا ایسے صفیر
ہونٹ تو چپکے رہ گئے لیکن نظروں میں پیغام کیا

بادۂ عشرت ہوش ربا تھا جو ہیں نے جام لیا
بارے یہ ہمت ساقی نے کی دوڑ کے مجکو تھام لیا

قتل کیا تو خجلت کیسی چھپ سکتا تھا خون کہیں
جس نے سُنا احوال ہمارا اس نے تمہارا نام لیا

بلبلِ نالاں اہلِ چمن کو خاک سناتی حال اپنا
پھیری چھُری صیاد نے فوراً دم بھر بھی نہ زیرِ دام لیا

گھورا اس انداز سے قاتل روح نے تن کو چھوڑ دیا
تیغ جو ٹوٹی عین برش میں اس نے نظر سے کام لیا

تیر اکشتہ دفن سے پہلے مچھلی تھا یا بجلی تھا
خاک کے تپنے جاکر آخر مضطر نے آرام لیا

دیکھنے مجکو آ جاتے تو بات تو ہوتی کہنے کو
عمر تو آخر ہو ہی چکی تھی تم نے عبث الزام لیا

قبر سے ہم لبیک پکارے چین نہ آیا ہم کو صفیر
رو رو کر تلقیں میں اس نے جب کہ ہمارا نام لیا

تری زلف پہ ہم جو فدا ہوئے تو اثر نمائے بقا ہوئے
جو چلے تو قم کی صدا ہوئے جو گرے تو خاکِ شفا ہوئے

بنے خاک کچھ ہم اگر بنے نہ کسی کے عقدہ کشا ہوئے
نہ کمال پا کے اثر بنے نہ اثر بڑھا کے دوا ہوئے

یہ جیں جو ہوتے ہیں منچلے انھیں دل سے اپنے ہیں مشغلے
جو بڑھے شباب کے ولولے وہی بڑھتے بڑھتے ادا ہوئے

جو جواں ہوئے تو رواں ہوئے جو رواں ہوئے تو دواں ہوئے
یہ عجب طرح سے جواں ہوئے کہ غبارِ راہِ وفا ہوئے

چمنِ جہاں میں نہ پوچھئے یہ دو روز کیسے بسر کئے
جو بہار تھی تو بقا ہوئے جو خزاں ہوئی تو فنا ہوئے

وہ بلندیاں ہیں نہ پستیاں وہ مکیں ہیں اب وہ بستیاں
جو نظر کے آگے تھے کل یہاں وہ نظر اٹھاتے ہی کیا ہوئے

نہ صفیرؔ ہیں نہ وہ روپ ہے فقط ایک ڈھلتی سی دھوپ ہے
یہی اب ہیں سوچتے شیب میں وہ مزے شباب کے کیا ہوئے

ہوا ہے غمِ ساقی لاجواب میں آب — یہ شیشہ آپ ہوا حسرتِ شراب میں آب
بوقتِ غسل لٹیں موجوں سے لپٹتی ہیں — تمہاری زلف سے رہتا ہے پیچ و تاب میں آب
مگر ڈلنے میں نہ گھٹا کچھ بناؤ صاحب کا — تمہارے رُخ کی بڑھی اور کبھی عتاب میں آب
تمہارے رنگ کی پائی کہاں سے آگ نے تاب — تمہارے چہرے کی آئی کہاں سے آب میں آب
کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسبِ موقعِ وقت — صفیرؔ آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

بُتوں کی خدائی میں جو شہرت ہوئی — عیاں ذاتِ باری کی قدرت ہوئی
وہاں غیروں کو زور ان سے ہوا — یہاں ناتوانی کو طاقت ہوئی
دل و دیدہ میں، دیر و کعبہ میں — تجسس تمہاری نہایت ہوئی
ترے کشتوں کی دیکھی جب آبرو — خضر کو بھی مرنے کی حسرت ہوئی
لحد میں میں تڑپا زمیں ہل گئی — تو مردے پکارے قیامت ہوئی
نہ آئینہ دیکھا کبھی یار نے — سکندر سے ایسی کدورت ہوئی
سخن کے سبب سے ہر اک شہر میں — صفیرِ سخن گو کی شہرت ہوئی

ضامن

شیخ ضامن علی تخلص ضامنؔ ولد شیخ ابوتراب باشندہ لکھنؤ۔ شاگرد اسیرؔ
۱۸۷۷ء میں آپ کا دیوان شائع ہوا ہے۔ مزید تعارف حاصل نہیں ہو سکا۔

جس کو سمجھے تھے صحیح ہم اس کو پایا اب غلط — جز تجلّی یار کی دیکھا نظر آیا غلط!
دفترِ موہوم ہستی کا سبق ہم پر کھلا — خود غلط مضموں غلط انشا غلط املا غلط
جس نے دیکھا برملا روئے جمالِ نازنیں — ہو گیا سودا مجازی زلف کا سارا غلط
سچ بتا اے مولوی کس وہم نے گھیرا تجھے — عشق میں حوروں کے سمجھا عشق مولا کا غلط
آنکھ حق بیں کھول دے اور آنکھ خود بیں بند کر — دیکھ تو اب کیا صحیح ہے اور ہے کیا کیا غلط
مصحفِ روئے جمالِ یار ضامنؔ ہے صحیح — وحی ما زاغ البصر ہے اور سب جھگڑا غلط

چھاتی سے کیوں نہ عشق میں رکھوں لگائے داغ — ہے داغ دل کے واسطے دل ہے برائے داغ
ہر چند ہم نے غم کے جو اپنے چھپائے داغ — چھپتے ہیں کب چھپائے سے جو ہم نے کھائے داغ
دیکھی جو میرے سینۂ پُر داغ کی بہار — بلبل نے آ کے آنکھوں سے میرے لگائے داغ
میں سوزِ غم سے جلتا ہوں خورشید کی طرح — رکھتا ہوں سینہ میں دلِ سوزاں بجائے داغ
عریانی کا جنوں میں نہیں ہے ہمیں خیال — پہنائی ہے جنوں نے ہمیں کبھی قبائے داغ
دکھلایا میں نے جو تنِ گل خوردہ باغ میں — طاؤس نے بھی شرم سے اپنے چھپائے داغ
روشن چراغ قبر میں سینہ پہ ہیں مرے — ضامنؔ فراقِ یار میں میں نے جو کھائے داغ

چشمِ گریاں سینہ بریاں سینکڑوں — ہیں ترے کوچہ میں جاناں سینکڑوں
اے صبا کر کے پریشاں زلفِ یار — کر دئے ہیں دل پریشاں سینکڑوں
کس طرح جاؤں عزیزو اس کے گھر — ہیں کھڑے ہر در پہ درباں سینکڑوں
ناقۂ لیلیٰ نہیں ملتا ہے قیس — چھان ڈالے ہیں بیاباں سینکڑوں
جس کے ہو ہر کام میں ضامنؔ علی — مشکلیں ہوں اس کی آساں سینکڑوں

سامنے لب کے ترے لعلِ یمن پتھّر کے — روبرو دانتوں کے ہیں دُرِّ عدن پتھّر کے
رحم آتا ہی نہیں گریہ و زاری پہ مری — دل بنا بیٹھے ہیں بُتِ وعدہ شکن پتھّر کے

دیکھو فرہاد نے کس شوق سے چیرا تھا پہاڑ | اس نے کیا کیا نہ سہے رنج و محن پتھر کے

مار ڈالو گے نہ جائیں گے ترے کوچہ سے | ہم وہ دل سنگ ہیں رکھتے ہیں بدن پتھر کے

کیا سبب ہے جو نہیں آتی صدائے نالہ | آج کیا بن گئے مرغانِ چمن پتھر کے

فی الحقیقت رازدانی اور ہے | واعظو یہ قصہ خوانی اور ہے

مر گیا مرنے سے پہلے جو کوئی | اس کی عمرِ جاودانی اور ہے

کوہکن نے جانِ شیریں مفت دی | جاں فشانی اور ہے اور کامرانی اور ہے

زاہد و کعبہ کا بانی ہے خلیل | کعبۂ دل کا تو بانی اور ہے

نامہ بر خط دے کے کہنا حالِ زار | میرا لکھنا اور ہے کہنا زبانی اور ہے

یاد آیا وصل کا دن ہجر میں | یہ بلائے ناگہانی اور ہے

ان بتوں کے عشق میں مت جان دے | ضامن اپنا یار جانی اور ہے

جو دیکھا کوئے جاناں میں تو برپا شورِ محشر ہے | صدائے الاماں ہے جا بجا اللہ اکبر ہے

وہ اس کا مصحفی چہرہ وہ اس کا حسنِ بے پایاں | کتابِ عالمِ امکاں بھی اس کا ایک دفتر ہے

بتِ کافر کی الفت میں تو ہم بھی ہو چکے کافر | صنم کا دل مگر اب تک وہی پتھر کا پتھر ہے

میں وہ مجنوں ہوں اے لیلیٰ میرا آرام بس یہ ہے | سرِ ہر خارِ صحرا پر بچھایا اپنا بستر ہے

ہمارا ناخدا دل ہے تنِ کشتی میں اے ضامن | کہ جس نے عشق کے دریا میں پھینکا اپنا لنگر ہے

آشناؤں کی عزیزو آشنائی دیکھ لی | اس زمانے کی وفا اور بے وفائی دیکھ لی

جبہ و دستار و تسبیح اور واعظ واعظاں | ان دغابازوں کی ہم نے پارسائی دیکھ لی

جز خدا کے عشق کے حاصل نہیں کچھ واعظا | کعبۂ معبد میں کر کے جبہہ سائی دیکھ لی

ایک دن لایا نہ اس کو تو یہاں تک کھینچ کر | جذبۂ دل ہم نے تیری نارسائی دیکھ لی

یا خدا دکھلا دے ہم کو جلوۂ دیدارِ یار | تیرے ضامن نے خداوندا جدائی دیکھ لی

نظم ہوری

نشۂ مستی عروج پر ہے شرابِ گل کا خمار دیکھو
بہک رہے ہیں یہ طفلِ غنچہ چمن میں چل کے بہار دیکھو
سب کی رنگت کے ہیں نئے رنگ عبیر کیسر گلال خوش رنگ
کہ خاکِ عاشق لہو کی رنگت ہمارا اڑتا غبار دیکھو
اِدھر تو پچکاریاں ہیں ماری اُدھر ہے آنکھوں سے خون جاری
یہ ناتواں کو ہے بے قراری تم اک گیند اس کے بھی مار دیکھو
تمام ساماں سہاگ کے ہیں خوشی محبت کے راگ کے ہیں
سو یار بن دن یہ آگ کے ہیں یہ ہوری جل جائے یاد دیکھو
کہیں صراحی کرے ہے قلقل حریف مل مل کے پیتے ہیں مُل
چمن میں بلبل کلھے ہے یہی غل یہ ہوری کی شب گزار دیکھو
ملی بدن پر یہ خاک ہم نے جلا کے تن من تمہارے غم میں
جو اشک جاری ہیں چشمِ تر سے تو آنسوؤں کی پھوار دیکھو
وہ چتر کا نہلا ہے مُرلی والا کہ جس نے سکھیوں پہ رنگ ڈالا
تمہارا ضامن ہے دیکھا بھالا تم ایک گیند اس کو مار دیکھو

ضیغم

نام حافظ اکرام احمد خلف حافظ قطب الدین تخلص ضیغمؔ باشندہ رام پور دابادو شاگرد شاہ رؤف احمد رافتؔ سرہندی۔ آپ پیرزادے تھے۔ عروض و قوافی و صنائع و بدائع شعری میں بے مثال تھے۔ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ ریختی ہزل اور مرثیہ میں تہمانؔ تخلص فرماتے تھے۔ بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے۔ اور بہت سی زبانوں سے واقف تھے۔ طب یونانی، ہندی اور ڈاکٹری اور بیشتر فنون اور علم میں کامل تھے۔ آپ کلکتہ اور ڈھاکہ میں اکثر رہے ہیں۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں انتقال کیا۔

جذبۂ الفت نے کھینچا دل بتِ بے پیر کا
آج قائل ہوں میں مقناطیس کی تاثیر کا

رُخ میں ہے گرمی غضب کی قہر اس کی ہر ادا
دیکھے گر نقشہ تو ہوئے رنگ فق تصویر کا

جھوٹ میں کہتا نہیں ہر بات میں اعجاز ہے
دل نہ کیونکر چھین لے وہ عاشقِ دلگیر کا

حسن ہے جلوہ نما زلفِ چلیپا ہے بلا!
ابروؤں میں اس کے عالم حق ہے شمشیر کا

ہجر میں تیرے صنم ہر دم ہوں پیتا اپنا خوں
کٹ گیا ہر ایک بازو طائرِ تدبیر کا

رہتا ہے درد و الم احوالِ دل کس سے کہوں
خلق درباں بھی نہیں رکھتا بتِ بے پیر کا

زلفِ جاناں کا دمِ تحریر لازم ہے خیال
تا سمندِ طبع کی خاطر ہو کوڑا سانپ کا

نظم کو جادو بنایا یادِ نرگس نے تمام
فکرِ سنبل نے ذرا مضموں نہ چھوڑا سانپ کا

زلفیں آپس میں سدا ہو جاتی ہیں زیر و زبر
سانپ کے ہے واسطے موضوع گھوڑا سانپ کا

مدتوں دل میں رہا جو مارِ کاکل خیال
رفتہ رفتہ ہو گیا آخر وہ پھوڑا سانپ کا

تیری آنکھوں میں نہیں یہ سرمۂ دنبالہ دار
سر نکالے ہے پٹاری سے یہ جوڑا سانپ کا

اپنے سینہ میں وہی عشقِ نہاں ہے کہ جو تھا
کعبۂ دل میں وہی ذکرِ بتاں ہے کہ جو تھا

تیر انداز وہی آفتِ جاں ہے کہ جو تھا
کشتۂ ناز و ادا پیر و جواں ہے کہ جو تھا

آپ تشریف جہاں لایئے اے بندہ نواز
دیدہ و دل وہی صاحبِ مکاں ہے کہ جو تھا

آہ و نالہ ہے وہی اور وہی رونا ضیغمؔ
پر اثر نالہ و افغاں میں کہاں ہے کہ جو تھا

مرغِ جاں کیوں قفسِ تن سے نہ پرواز کرے
ہر پر ستمگار ہے شہپر اپنا

کسی عنوان نہیں جاتا جو خیالِ خطِ غیر
ہوش اڑ دیتا ہے ہر اک کبوتر اپنا

روز کا وصل روی سے تجھے دیتا ہے غرورؔ
شب مہتاب ہے اور آیا ہے دلبر اپنا

لوٹتا ہے کون ان روزوں بہارِ روئے دوست
کس کے ناخن ہیں کلیدِ قفلِ عقدِ موئے دوست

خندہ زن اس دست میں شاہا نہ یدِ بیضا یہ ہے
غیرتِ ثعبانِ موسیٰ کیوں نہ ہوں گیسوئے دوست

شب کو ان کے بام پر ہم نے لگائی جو کمند
گر پڑے چڑھ چڑھ کے مثلِ شانہ گیسوئے دوست

ساقی ہے مینا ہے اور گل کی بھی آئی فصل ہے
بادہ بھی تھوڑا سا پی اب تو جو کچھ ہو سو ہو

جیسے یہ جامہ ہے شق ویسے ہی دل ہے مرا
چیریں گے سینہ کو بھی اب تو جو کچھ ہو سو ہو

ملنے میں خوبوں کے ضیغم کوئی بچتا ہے جی
سر پہ یہ جو کھوں ہے لی اب تو کچھ ہو سو ہو

ہر شے کی عمر گھٹتی ہے دنیا میں دمبدم
یہ ہے زبانِ حال سے تقریرِ پائے شمع

تعریفِ ساقِ یار مرے دل سے پوچھئے
پروانے کچھ سمجھتے ہیں توقیرِ پائے شمع

آنکھوں میں کیا پتنگ کی ہے چربی چھا گئی
لیتا ہے بوسے شمع کے گلگیرِ پائے شمع

گالیاں غیروں کو اے غیرتِ شیریں سنا
تلخ ہو جائے نہ تیرا کہیں دشنام سے کام

چھاتی گدرائی ہوئی چھوتے ہی آفت آئی
ہو گیا سخت خراب اس طمعِ خام سے کام

مہر و مہ خدمتِ عالی میں سدا رہتے ہیں
صبح سے ایک کیا کرتا ہے اک شام سے کام

رُخ میں گرمی ہے غضب ہر بات میں اعجاز ہے
حسن ہے جلوہ نما رُخ کا عجب انداز ہے

ہجر میں تیرے صنم جینا ہے اب مجھ پر زبوں
رہتا ہے درد و الم غم مونس و دمساز ہے

زنجیر کی سن کر ترے محبوس کی جھنکار
مجنوں نے کہا ہے عجب افسوس کی جھنکار

ہیں چوڑیاں اس ساعدِ نازک میں قیامت
کیوں جان نہ لے عاشقِ مایوس کی جھنکار

آئی سحر نشانِ شبِ اصلا کہیں نہیں
پر آپ کی گئی نہیں اب تک نہیں نہیں

عریانی آئی جب سے یہ جھگڑا ہی مٹ گیا
کل جیب کٹتی کلی نہ تھی آج آستیں نہیں

طپش

نام مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان تخلص طپش خلف مرزا یوسف بیگ باشندہ دہلی شاگرد میر درد۔ دہلی سے لکھنؤ آکر مرزا جہاندارا شاہ بہادر کی رفاقت میں آگئے تھے۔ بعد ازاں مدت تک ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ کی رفاقت میں رہے سنسکرت زبان پر اچھا دخل رکھتے تھے۔ صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

قطعہ

طپش اب بیچتا ہے دل کو اپنے
بہا اس جنس کی کئی بوسوں پر ہے
ہوئے ہیں خوبرو کتنے خریدار
شناسائی میں جن جن کو نظر ہے
کوئی دو بوسے دیتے ہیں کوئی چار
دلے اس کا ارادہ بیشتر ہے
سو یہ ہے عرض خدمت میں تمہاری
کہ لینا آپ کو منظور گر ہے
تو اب اس سے بھی کچھ بڑھئے زیادہ
یہ چرخ نیلگوں نیلام گھر ہے

قطعہ

کہا جو دل سے چل تجکو تماشا اک دکھلاؤں
تہ کاکل عرق آلودہ وہ گردن جھلکتی ہے
لگا کہنے طپش میں گھر سے باہر کس طرح نکلوں
اندھیری رات ہے برسات ہے بجلی چمکتی ہے

ایسی کیا کی ہے دلا ہم نے بتوں کی چوری
دیکھ کر ہم کو جو یہ آنکھ چرا لیتے ہیں
جب کہیں غنچۂ پژمردہ نظر آیا ہے
دل سمجھ کر اسے سینہ سے لگا لیتے ہیں

نہ پیروی قیس نہ فریاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے
ہم خوش ہوئے سو راخوں کے پڑنے سے جگر کے
اب نے کی طرح شوق سے فریاد کریں گے

اشعار متفرق

کیوں وصل کی دل سے جائے امید
آخر دنیا ہے جائے امید
نہیں ممکن رہائی قید سے اس زلف شکیں کے
قلندر ہو کے ہیں بھی اس کے پیچھے سر منڈاتا ہوں

ناز سے منھ پھیر کر وہ اس طرف سونے لگے | چپکے چپکے لیکے کروٹ ہم ادھر رونے لگے
کبھی تو پاؤں کی ٹھوکر سے تری آشنا ہوتے | اگر خوابیدہ کوچے میں ترے جوں نقش پا ہوتے
دیکھیں گے جنازہ کو روکے گا کوئی کیوں کر | اب باندھ کے ہم بھی تو یہاں سر سے کفن نکلے

ظفر

نام ابوظفر سراج الدین شاہ بہادر دہلی۔ متخلص ظفر۔ آپ شاہ عالم ثانی کے پوتے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے بیٹے۔ ہندوستان کی حکومت دادا کے وقت میں جا چکی تھی۔ ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے اور آپ کی حکومت دلّی میں قلعۂ معلیٰ کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اقلیم سخن کی فرمانروائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی۔ آپ شاہ نصیر اور ذوق کے شاگرد تھے ۱۸۶۲ء میں ۹۰ سال کی عمر میں رنگون جیل میں انتقال کیا۔ چار دیوان بزبان اردو آپ سے یادگار ہیں۔

جلایا آپ نے ضبط کر کے آہ سوزاں کو | جگر کو سینہ کو پہلو کو دل کو جسم کو جاں کو
ہمیشہ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں | الم کو یاس کو حسرت کو بیتابی کو حرماں کو
جگہ کس کس کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے اے قاتل | کٹاری کو چھری کو بانک کو خنجر کو پیکاں کو
نہ ہو جب تو ہی اے ساقی بھلا پھر کیا کرے کوئی | ہوا کو ابر کو گل کو چمن کو صحن بستاں کو
نہیں قلقل دعا دیتا ہے شیشہ دم بہ دم ساقی | سبو کو خم کو مے کو میکدہ کو مے پرستاں کو
تجھے دل دیکے میں اے کافر بے مہر کھو بیٹھا | خرد کو ہوش کو طاقت کو جی کو دین و ایماں کو
بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر | ملک کو دیو کو جن کو پری کو حور و غلماں کو

دل کا آئینہ جب صفا دیکھا | وہ جو پنہاں تھا برملا دیکھا
کیا کہوں بتوں میں کیا کیا دیکھا | جلوۂ قدرت خدا دیکھا
تو وہ یکتا ہے تری صورت کا | نہ سنا نہ دوسرا دیکھا
یہ جہاں ہے عجب تماشا گاہ | ہر تماشا یہاں نیا دیکھا
ہم نے راہ خدا میں غیر از عشق | کوئی اپنا نہ رہنما دیکھا

خاک دنیا کی سیر کی ہم نے — یہ تو اک یونہی خواب سا دیکھا
کھول کر آنکھ اپنی مثل حباب — کچھ نہ ہم نے بجز فنا دیکھا
عشق ہے کیا بلا کہ اس میں ظفر — ایک عالم کو مبتلا دیکھا

اشعار متفرق

سر تلک دست ستم جو نہی ترا قاتل بڑھا — خون جسم ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا
کھائے بخیہ میں نہ کیوں عقل رفوگر چکر — چاک دل دیکھ رفو بھی ہے رفو در چکر
ہمیشہ باندھے ہیں شاعر شراب کو آتش — بڑے ہی جھوٹے ہیں کہتے ہیں آپ کو آتش
یوں تو مدت سے ہے الطاف و عنایات میں فرق — لیکن ایسا نہ ہو آجائے ملاقات میں فرق
جو کچھ وہ پوچھے تو رک جائیو نہ اے قاصد — تجھے خدا کی قسم کہیو تو تڑاق پڑاق
کبھی تو آؤ ہمارے گھر میں سنو ہماری بھی چار باتیں — عجب ہے شکوہ رقیب کا یاں ہزار منہ ہیں ہزار باتیں
ہم بتوں کے دل کو جذب دل سے کھینچ لائیں گے — پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے
ہیں ستاروں سے پر چرخ پیر کی جھولی — بھری ہے کوڑیوں سے اس فقیر کی جھولی
نہ پہنچا کوئی اپنے پاس پہنچا جب کہ وقت آیا — اجل کو آفریں ہے وقت پر پہونچی تو یہ پہونچی
تم لاکھ کرو حضرت دل نالہ و فریاد — چاہو کہ ہو کچھ اس کو اثر ہو نہیں سکتا
کیا کان بھر دیے ہیں خدا جانے غیر نے — غصے میں جو بھرے ہے وہ کافر بھرا بھرا
ظالم ترے چپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا — کیا جانے کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا
ہمیشہ رہتے ہیں ان کی مصاحبت میں وہی — ظفر ملاتے ہیں جو ہاں سے ہاں نہیں سے نہیں
کسی کے دل کے پرزے کر رہے ہو بیٹھے پردہ میں — نہیں یہ چھالیاں چلمن کے اندر تم کترتے ہو
ہاتھ اٹھانے کے نہیں زلف رسا سے کچھ ہو — ہو چکے ہم تو سیہ بخت بلا سے کچھ ہو
خط اسے جلدی میں لکھتا ہوں قلم برداشتہ — جائیو اے نامہ بر تو بھی قدم برداشتہ
اشک کے قطرے لئے جاتے ہیں بھر بھر کر سبو — جوش گریہ نے مری آنکھوں کو پنگھٹ کر دیا
ہوں جو ٹیڑھے ترچھے دکھلا ان کو اپنا بانکپن — ہم ہیں سیدھے سادے ہم سے بات کر سیدھی طرح
گالیاں دے چکے اب نالہ و زاری تو سنو — اپنی سب کچھ کہہ چکے تھوڑی سی ہماری تو سنو

ہو گیا اور زیادہ وہ کشیدہ ہم سے ۔۔۔ دوستو کیا کشش دل کا اثر پوچھتے ہو

ساغر ہیں حباب مئے گلرنگ ہے ساقی ۔۔۔ یاد دختر رز کے ہے یہ محرم کا نمونہ

نہ چھو کو آج گر ہے کچھ ارادہ ہاتھا پائی کا ۔۔۔ کہ اس نے دست دیا میں اے ظفر مہندی لگائی ہے

تل داغ ہیں چیچک کے جو اس نے بنایا ہے ۔۔۔ معلوم کیا ہم نے کچھ دال میں کالا ہے

کعبہ کی سمت ہم نے کیا منھ پیے نماز ۔۔۔ برگشتہ نیت اپنی سوئے دیر ہو گئی

خدا بچائے ظفر دوستی سے اس دل کی ۔۔۔ جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

واہ تم صبح کو نکلے آتے ۔۔۔ دن چڑھے کہہ کے دن ڈھلے آئے

دل ہوا ناوک مژگاں کا نشانہ سچ مچ ۔۔۔ آگیا تم کو یہاں تیر چلانا سچ مچ

تیرا مریض مر ہی گیا تین دن کے بعد ۔۔۔ اچھا اثر دوا نے کیا تین دن کے بعد

مرے مژگاں سے آنسو اس طرح برسوں برستے ہیں ۔۔۔ کہ جوں برسات کے موسم میں مینہ چھاجوں برستے ہیں

تیری چشم مست کو جو دیکھے ہو جائے خراب ۔۔۔ خواہ صوفی خواہ ہو میخوار اس میں کوئی ہو

میں کروں توبہ مے سے جھوٹ نہ بول ۔۔۔ توبہ کر زاہد معاذ اللہ

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبہ کا ۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

سوئیں بچھ بن چین سے کیا زیر سر ہم رکھکے ہاتھ ۔۔۔ تار بخیہ آستیں میں آستیں کا سانپ ہے

میں جو کہتا ہوں بے وفا ہے رقیب ۔۔۔ وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو کیا ہے

دین کے ستون ہیں پنجتن و چار یار پاک ۔۔۔ قرباں ہیں ہم تو دل سے ظفر چار پانچ کے

عارف

نواب زین العابدین خاں متخلص عارف خلف نواب غلام حسین خاں خسرور باشندہ دہلی۔ شاگرد شاہ نصیر و مرزا غالب۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں واصل بہ حق ہوئے۔ صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

مجکو اور آپ کو عالم میں نہ رسوا کیجے ۔۔۔ آپ ہو رہیے مرے یا مجھے اپنا کیجے

اے غم عشق وہ دل جس کو بغل میں پالا ۔۔۔ ہیویں اس کا یہ لہو کیونکہ گوارا کیجے

ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائینگے ۔۔۔ ہیں حسیں آپ طرفداری لیلا کیجے

آج کچھ شکل ہے کل اور ہے صورت اپنی
عاجز آئے نہ کیونکر ترا درباں ہم سے

جمع جب تک نہ کئے حرفِ مقطع ہم نے
خط میں لکھا نہ گیا حالِ پریشاں ہم سے

اے پری تیری زباں کی نہیں فہمید ہمیں
اس سبب اٹھتی ذرا لذّتِ دشنام نہیں

امتحاناً وہ مرض کا مرے کرتے ہیں علاج
یہ بھی ہے فضلِ خدا جو مجھے آرام نہیں

کیوں نہ غیرت سے مروں میں کہ مجھے پردہ نشیں
عالم الغیب سے ممکن نہیں پنہاں کرنا

نہ خداوند کو گر پاک منزہ سمجھوں
کب گوارا ہو مجھے تجھ پہ نگہباں کرنا

ہماری خاک سے اس کو کدورت کب کی ہے یارب
سکھایا ہے اُسے چلنا اٹھا کر جس نے داماں کا

کہاں سے آگئی اس میں تری رفتار کی تیزی
کہ چلنا قتل کرتا ہے ہمیں شمشیرِ برّاں کا

اشعار متفرق

رسوا ہوا تو اہلِ وفا میں ہوا عزیز
اچھا ہوا وہ حق میں مرے جو بُرا ہوا

شوخی وہ بھری ہے کہ ذرا جا نہیں پاتی
دشوار ہے آنا تری آنکھوں میں حیا کا

بیٹھ کر کس فکر میں تم نے مروڑا دیر تک
جا بجا جو آپ کے بندِ قبا میں بل پڑا

سخت شرمائے ہیں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بیجا کرتا

دیوانگی میں غیر کو دوں خاک گالیاں
اب مانتا ہے کون بُرا میری بات کا

مفلسوں کو تو ہے مرنا بھی جُدائی میں محال
کھائینگے کیا، نہ اگر زہر میسر ہوگا

اسی انداز پہ ٹھہری جو قیامت آنی
ہے خدا کو بھی کہیں کیا تری رفتار پسند

دے چکا ہے ترے بیمار کو عیسیٰ تو جواب
لبِ جاں بخش ترے دیکھئے کیا کہتے ہیں

غصّے میں ان کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اٹھائے عتاب میں

نہ تو روزن کوئی سینہ میں نہ پہلو میں شگاف
دل سے ارماں مرے نکلے تو کیونکر نکلے

بے کسی میں مجھے ہوتی ہے غنیمت وہ بھی
کوئی جس وقت مرے سر پہ بَلا آتی ہے

کس تعجب سے اسے غور سے ہم سنتے ہیں — کہیں آپس میں اگر ذکرِ وفا آتا ہے

عاشق

نام نہ معلوم شاگرد آتش لکھنوی۔ آپ خاص لکھنؤ یا اس کے اردگرد کے باشندے تھے۔ استاد شاعر ہوئے ہیں۔ آپ کا دیوان موسومہ "دیوانِ عاشق" ۱۸۷۶ء میں مطبع منشی نول کشور کانپور میں چھپا ہے دیوان نظر سے گزرا ہے باوجود کافی تلاش کے آپ کا مزید تعارف دستیاب نہیں ہو سکا۔

خمار آلودہ آنکھیں جھومتا مستانہ آتا ہے — لئے شیشہ بغل میں ہاتھ میں پیمانہ آتا ہے
نگہ ترچھی جھکی گردن اٹھا سینہ ادا بانکی — عجب ناز و ادا سے دلبرِ جانانہ آتا ہے
تو اپنی زلفِ پیماں میں اُسے پابند کر کافر — ترے کوچہ میں اکثر یہ دلِ دیوانہ آتا ہے
عبث بڑھ کر نہ بول اپنے گریباں کی ذرا بولی — ابھی تو محتسب بے لذتِ میخانہ آتا ہے
ترے چہرے کے گرد اگر داب سبزہ ہو اپیدا — کہ اس کو منع گلرو کیوں یہاں بیگانہ آتا ہے
ہجوم حسرت و اندوہ و حرماں ساتھ ہیں کے — ترے کوچہ سے با حشمت دلِ دیوانہ آتا ہے
یہ تاثیرِ محبت دیکھنا، وہ دیکھ کر مجھکو — یہ کہتا ہے کہ میرا عاشقِ دیوانہ آتا ہے

چرخ نے غم یہ کھلایا ہے کہ جی جانتا ہے — اور خوں دل کا پلایا ہے کہ جی جانتا ہے
چشمِ گریاں نے مری ہجر میں رو رو کر — ابر کو ایسا بہایا ہے کہ جی جانتا ہے
زلفِ شبگوں نے مجھے پیچ میں لا کر دن رات — جال میں ایسا پھنسایا ہے کہ جی جانتا ہے
عشقِ جاناں نے غم و درد کو ایسا یارو — دل کی بستی میں بسایا ہے کہ جی جانتا ہے
بت نے قدموں سے جدا کر کے خدایا ایسا — خاک میں مجھکو ملایا ہے کہ جی جانتا ہے
مصحفِ رخ نے ترے مجھکو بھلا کر قرآن — درسِ عشق ایسا سکھایا ہے کہ جی جانتا ہے
فکرِ باریک کمر نے ترے عاشق کو میاں — منحنی ایسا بنایا ہے کہ جی جانتا ہے

جلوہ فرما رخِ پُر نور ہوا خوب ہوا — آج یاں معجزۂ طور ہوا خوب ہوا

دشمن اپنا بت مغرور ہوا خوب ہوا
جو خدا کو بھی تھا منظور ہوا خوب ہوا

شکوۂ بخت ہے بیجا کرو تسلیم کی خو
جو کہ پیشانی میں منظور ہوا خوب ہوا

تو بھی میرے دلِ حیراں کی طرح آئینہ رو
محوِ رُخِ پُرنور ہوا خوب ہوا

جس طرح عاشق بیچارہ تھا تجھ سے مجبور
تو بھی عیّار سے مجبور ہوا خوب ہوا

وحشتِ دل سے یہ جی میں ہے کہ کپڑے پھاڑ کر
جاؤں صحرا کو نکل بستی سے دامن جھاڑ کر

قیس اور فرہاد سے کہہ دو کہ بیعت آکے لیں
عشق کے میداں میں ہم بیٹھے ہیں جھنڈا گاڑ کر

چرخ کے مانند اس کو بھی نہ کیجے بیقرار
لاش میری اے ستمگر اس زمیں گاڑ کر

روز و شب تڑپے ہے مرغِ دل فراقِ یار میں
ہجر کیا لپٹا ہے اس کو آہ پنجے جھاڑ کر

قتلِ عاشق گر تجھے منظور ہے اے شوخ چشم
سنگِ سُرمہ سے تو شمشیرِ نگہ کو باڑ کر

مجنوں کا دم ہے آنکھوں میں جلدی نقاب الٹ
بہرِ خدا تو لیلیِ پردہ نشیں الٹ

کیوں نازشِ یار تو کرتی ہے آ اجل
آجا کہ انتظار میں آنکھیں گئیں الٹ

نادیدہ رہ گئے یار ہوں اے دوستو مرے
دیکھو کفن کو چہرہ سے زیرِ زمیں الٹ

عاشق کی لاش سے دلِ مضطر نکالیے
یہ بیقرار دیگا وگرنہ زمیں الٹ

اس کی زلفوں سے دل لگاکر
کھویا مجنوں اسے بنا کر

میری آہوں نے آسماں کو
پھینکا آخر کو ہلہلا کر

یہ جور و ستم بس اب کہاں تک
جلنے دے صنم خدا خدا کر

کل ذکر مرا تھا کیا یہ سچ ہے
بولے ہاں سچ ہے مسکرا کر

اس کی زلفِ دوتا نے عاشق
مارا سو پیچ میں پھنسا کر

کل وہ گل مرقد پہ میری پھول دو دھر ہی گیا
بس رقیبِ روسیاہ اس رشک سے مر ہی گیا

جبکہ میں اس بے وفا کے پاس پہونچا بر محل
تو وہ اٹھکر واں سے دشمن کے برابر ہی گیا

عاشقِ شوریدہ سر کا شکر در دِ سر گیا
ہر گھڑی جسمیں غمِ جاناں تھا وہ سر ہی گیا

ہر اک سمت سے صوتِ ہزار آتی ہے
چمن میں دھوم ہے فصلِ بہار آتی ہے

اسے نظر نہیں آتا مرا تنِ لاغر
اجل کبھی ڈھونڈنے کو بار بار آتی ہے

تو وہ ہے یوسفِ خوباں خرید نے کو ترے
زلیخا آپ ہی ہو بے قرار آتی ہے

تری جو زلف نے حد سے قدم رکھا باہر
یہ جا کے دیکھئے اب کس کو مار آتی ہے

مرے نصیب یہ کیا خواب میں کھلیں گے آج
جو نیند مجکو صنم بار بار آتی ہے

فصلِ جوشِ بہار ہے ساقی
موسم خوشگوار ہے ساقی

میرا مشفق ہے یار ہے اب تو
فصلِ پروردگار ہے ساقی

آب آتی ہے چشم میں اس سے
بادہ کیا آبدار ہے ساقی

عشرت

نام میر غلام علی تخلص عشرتؔ باشندہ بریلی۔ شاگرد مرزا علی لطفؔ
آپ نے پدماوت کی مثنوی کو جو عبرتؔ سے رہ گئی تھی ۱۲۱۱ھ میں مکمل کیا تھا
صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

شبِ وصال میں دل پر قلق ابھی سے ہے
سحر ہے دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے

ہنوز دفن ہوا بھی نہیں ترا بسمل
کہ زلزلے میں زمیں کا طبق ابھی سے ہے

میں لکھ چکا بھی نہیں حالِ دل کہ اس کی طرف
ہوائے شوق میں اڑتا ورق ابھی سے ہے

کسی نے شام کا وعدہ کیا ہے کیا عشرتؔ
کہ پھولی آپ کے منھ پر شفق ابھی سے ہے

اشعار متفرق

بسانِ جام خالی پھوڑ ڈالوں چشمِ پُر خوں کو
نہ دیکھوں گر صراحی دار اس مخمور کی گردن

غیروں سے ہنسا وہ جو مرے سامنے عشرتؔ
کچھ بس نہ چلا دیکھ کے آنسو نکل آئے

روٹھتے ملتے تھے جن سے ساری ساری رات ہم
کیا غضب ہے کر نہیں سکتے اب ان سے بات ہم

عظیم

نام مرزا عظیم بیگ متوطن توران۔ باشندہ دہلی شاگرد شاہ حاتم و مرزا سودا۔ سنہ ۱۲۲۱ھ میں وفات کی۔

اشعار متفرق

کل چشمِ خونفشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ اک تختۂ چمن تھا

شب جو بزمِ خوبرویاں میں ہوا اس مہ کا ذکر
جوں چراغِ خانۂ مفلس ہر اک خموش تھا

تقریرِ سرگذشت نہ پوچھو کہ خامہ وار
آتا ہے گریہ ہر سرِ حرفِ بیان پر

تلوار سا بلند ہے جن کا کہ حوصلہ
دریا دلوں کو مارے ہیں تنگی کی دھار پر

بھڑکا دیا ہے آہ نے دامانِ شفق کو
اے چرخ سنبھلنا کہ لگی متصل آتش

روشن دلوں کو کور سوادوں سے ہو نہ ربط
کیا آئینہ کو دیدۂ تصویر سے غرض

حاجتِ شرح و بیاں رکھتے نہیں روشن ضمیر
واقفِ ہر نیک و بد ہے گو ہے خموش آئینہ

میں کیونکر تجھ سے کہوں حالِ دل کہ مثلِ تفنگ
صدا کے نکلنے کے آگے دہن میں اک آگ لگی

سرخ یہ تکمہ ہے یارب یا ستارہ آتشیں
یا کسی عاشق کا خون اس کے گریباں گیر ہے

کس نگاہِ مست کا زخمی ہوں یارب میں کہ اب
جائے خوں ہر زخم سے جاری شرابِ ناب ہے

چلتی ہے شرحِ سوز سے میرے زبانِ کلک
ہر دم ملی ہے لی جو سیاہی دوات سے

ایک واقعہ۔ عظیم صاحب نے اپنی ایک تازہ غزل کسی صاحب کو سنائی جو بحرِ رجز میں تھی مگر ناواقفیت کے سبب غزل کے کچھ شعر بحرِ رمل میں جا پڑے۔ سیّد انشاؔ بھی وہاں موجود تھے تاڑ گئے اور غزل کی بہت تعریف کی اور عظیم صاحب سے اصرار کیا کہ غزل کو مشاعرے میں آپ خود پڑھیں۔ عظیم صاحب اپنی غزل کے اس عیب سے قطعی بے خبر تھے۔ لہٰذا آپ نے وہ غزل مشاعرہ میں پڑھ دی۔ سیّد انشا نے غزل کے اس عیب پر مشاعرہ میں ٹوک دیا اور انشا صاحب نے ایک مخمس پڑھا

جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

کہتوں عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل کر چلے ۔ گر تو مشاعرے میں صبا آجکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے ۔ اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

جواب میں عظیم صاحب نے بھی ایک مخمس کہہ کر اپنے دل کا غبار نکالا

جس کے چند بند مندرجہ ذیل ہیں۔

وہ فاضلِ زمانہ ہو تم جامعِ علوم ۔ تحصیلِ صرف و نحو سے جنکی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم ۔ منطق بیاں معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

ایک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھے ایسے طاق ۔ دیوان شاعروں کے نظر سے رہے بہ طاق
ناصر علی ۔ نظیری کی حالت ہوئی ہے طاق ۔ ہر چند ابھی نہ آئی ہے فہمیدِ جفت و طاق
ٹھنگر تلے سے عرفی و قدسی نکل چلے

کفار و زِ فکر میں کہ کہوں معنی و مثال ۔ تجنیسِ دہم رعائت لفظی و ہم خیال
فرقِ رجز و رمل نہ لیا میں نے گو سنبھال ۔ نادانی کا مری نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدرِ فکر یہی کر عمل چلے

نزدیک اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دور ۔ خوب جانتے ہیں مجھے جو ہیں ذی شعور
وہ بحر کونسی ہے نہیں ہے جس پہ یاں عبور ۔ کب میری شاعری میں پڑے شبہہ سے قصور
بنکر تم نکالنے کو تم خلل چلے

موزونی و معنی میں پایا نہ تم نے فرق ۔ تبدیلِ بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا شرق ۔ شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کم ظرفی سے تمہیں تو یہی آتی ہے امنگ ۔ کیجے نمود خلق میں اب کر سخن کی جنگ
اپنے تئیں تو بجھتے آتا ہے یار ننگ ۔ اتنا بھی رکھیے حوصلہ فوارہ سا نہ تنگ

چلو ہی پانی بھر میں جو اتنا اچھل پڑے

کیوں جنگ گفتگو کو تم اٹھ دوڑے اس قماش
کرتے جو بھاری پائچہ ہوتا نہ پردہ فاش

پر سمجھیں کب یہ بات جو کندے ہوں ناتراش
تیغِ زباں کو میاں میں رکھتے تم اپنی کاش

ناحق جو تم ازار سے باہر نکل چلے

عیش

نام مرزا امیتا تخلص عیشؔ خلف مرزا امداد حسین باشندہ گرڈھی میر نعیم خاں متعلق لکھنؤ۔ مقیم مٹیا برج متعلق کلکتہ۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں حیات تھے۔

کشاکش یارِ گیسو میں عیاں تھی ہر رگِ تن سے
بتاؤں کیا شبِ ہجراں کٹی ہے کیسی الجھن سے

نظر آتے ہیں صحرائے جنوں کے رنگ گلشن سے
عجب وحشت نمایاں ہے گلوں کے چاکِ دامن سے

اثر سوزِ جنوں کا کوئی مانی سے ذرا پوچھے
چراغ آسا مری تصویر جل اٹھی ہے روغن سے

دکھا دو تم جو حسنِ کعبۂ رخ دیر میں جاکر
صدا تکبیر کی پیدا ہو ناقوسِ برہمن سے

عیاں ظلمِ خزاں ہے بولتا ہے خونِ بسمل کا
صدائیں ہائے گل کی آرہی ہیں صحنِ گلشن سے

شمع ساں رکھتے ہیں ہم عشق میں اے یار قدم
سر بھی کٹ جائے تو ہٹتے نہیں زنہار قدم

وہمِ عارض سے گلوں کو ہیں بچا کر چلتے
باغ میں رکھتے ہیں ہم پھونک کے ہر بار قدم

یوں ترا زار ہے ہر گام پہ آہیں بھرتا
رکھتے ہیں جیسے عصا ٹیک کے بیمار قدم

صلح ان سے ہمیں کئے ہی بنی
دل پہ جھگڑا تھا دل دئے ہی بنی

زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے
ہاتھ سے اس کے مے پئے ہی بنی

لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار
پاس اپنے بٹھا لئے ہی بنی

کس کا تھا پاس شوقِ ظلم کہ عیشؔ
ان جفاؤں پہ جئے ہی بنی

دو شعر

اک زلف کا بل ہو تو کہوں سینکڑوں بل ہیں
پیشانی سے ابرو تلک ابرو سے کمر تک

قدر رہی جب نہ ہو کسی کی تو پھر
کیوں کوئی جان دے کسو کے لئے

عیشی

طالب علی خان متخلص عیشی ولد علی بخش خاں باشندہ لکھنؤ شاگرد مرزا قتیل۔ بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کو مصحفی کا شاگرد بھی لکھا ہے۔ دیوان فارسی و ریختہ و مجموعۂ نثر و سرو چراغاں آپ سے یادگار ہیں۔

دل گرفتہ ہوں کروں گا ہو کے میں آزاد کیا
مجکو یکساں ہے چمن کیا خانۂ صیاد کیا

زخم کاری جسم پر کشتوں کے تازہ ہیں ابھی
آب حیواں میں بجھا ہے خنجر جلاد کیا

سخن اس کے عجائب لطف لکنت میں دکھاتے ہیں
نزاکت سے زباں پر لفظ کیا کیا لڑکھڑاتے ہیں

تن تنہا مبادا منزل ہستی میں رہ جاؤ
اٹھو عیشی عدم کو قافلے یاروں کے جاتے ہیں

رات ساقی نے عجب جلوہ گری دکھلائی
مجھے ہر شیشہ میں دیتی تھی پری دکھلائی

میں نے عیشی سے جو پوچھا دل پرخون کا حال
اک صراحی مئے گلگوں کی بھری دکھلائی

اشعار متفرق

ڈبوئیں انگلیاں کس بے گناہ کے خون میں تو نے
کہ جس کا رنگ ہے رشک گل شاداب ناخن پر

کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہ تھا
اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

کیا کہوں آتش عنانی کرسکے گھوڑے کی فکر
برق جائے نعل رکھتا ہے وہ توسن زیر پا

غالب

نام اسد اللہ خاں معروف مرزا نوشہ متخلص غالب ولد عبداللہ بیگ آپ کی ولادت ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں ہوئی۔ آپ کا خاندانی سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے شاہ عالم کے زمانہ میں آپ کے والد دہلی آگئے تھے اور یہاں فوج کے ایک معزز عہدہ پر مامور ہوگئے تھے۔ شاہ عالم کے بعد آپ کے والد لکھنؤ جاکر آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوگئے اس کے بعد آپ کے والد حیدرآباد میں نظام علی کے یہاں تین سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوگئے وہاں سے پھر الور آگئے اور راجہ بختاور سنگھ کے یہاں ملازم ہوگئے اور یہاں کسی لڑائی میں

سنہ ۱۸۰۱ء میں مارے گئے۔ اس وقت غالبؔ صاحب قریب چار سال کے تھے۔ آپ کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ جو مرہٹوں کی طرف سے آگرہ میں صوبہ دار تھے آپ کو اپنے دامن میں لے لیا اور ان کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے اتفاق سے وہ بھی کسی لڑائی میں مارے گئے اس وقت غالبؔ کی عمر پانچ سال کی تھی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائداد چھوڑی تھی۔ مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور غریبانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد آپ رام پور چلے گئے وہاں نواب صاحب نے آپ کا سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہاں آپ زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور پھر دہلی واپس آگئے مگر ریاست رام پور سے وظیفہ بدستور ملتا رہا۔ آپ کچھ روز کلکتہ بھی رہے شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ مسلم الثبوت استاد ہو گئے شاعری میں آپ کسی استاد سے منسلک نہیں رہے آپ ابتدا میں اسدؔ تخلص فرماتے تھے مگر بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا سنہ ۱۸۶۹ء میں دہلی میں وفات پائی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منھ سے جاؤ گے غالبؔ — شرم تم کو مگر نہیں آتی

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — مری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گو نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

غالب چھٹی شراب مگر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے سبب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انساں ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہوں جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

فغاں

نام اشرف علی خاں تخلص فغاںؔ۔ شاگرد علی قلی خاں ندیم۔ آپ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ احمد شاہ درانی کے حملوں نے جب دہلی کو تباہ و برباد کر دیا آپ دہلی سے مرشد آباد چلے آئے پھر وہاں سے فیض آباد آگئے۔ اس کے بعد عظیم آباد پہونچ گئے۔ وہاں راجہ شتاب رائے نے آپ کی بڑی قدر کی اور تمام عمر وہیں گزار دی ۱۷۷۲ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔

خط دیجیو چھپ کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
بادِ صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو
مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا وفورِ خوش نہیں آتا ہے اشک کا
عالم کو مت ڈبویو اے چشمِ تر کہیں
میری طرف سے خاطرِ صیاد جمع ہے
کیا اڑ سکے گا طائرِ بے بال و پر کہیں

تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے
ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا
مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں

باور تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے
آنسو کہیں ڈھلک گئے لختِ جگر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی
اے عندلیب تو نہ قفس کے بیچ مر گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے اشکِ سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

اتنی کہاں رفیق بصارت ہے چشم کی
دل بھی ادھر گیا مری جیدھر نظر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں
انصاف کو نہ چھوڑ مروت اگر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی مری ووں بھی گزر گئی

آخر فغاں وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

صنم بتا تو جدائی کا مجھ کو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بت ہوا خدا نہ ہوا

کباب ہو گیا آخر تو کچھ برا نہ ہوا
عجب یہ دل ہے، جلا بھی تو بے مزا نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچے کے تئیں پریشانی
بھلا ہوا کبھی کافر جو مجھ سے وا نہ ہوا

موا نہ میں جیا آخر کو نیم بسمل ہوں
غضب ہوا مرے قاتل کا مدعا نہ ہوا

طرف سے اپنی تو نیکی میں ہے مزہ صاحب
مری بلا سے فغاں کا اگر بھلا نہ ہوا

بے فائدہ ہے آرزوئے سیم و زر فغاں
کس زندگی کے واسطے یہ دردِ سر فغاں

جلتے ہیں اس گلی میں فرشتے کے پر فغاں
کیوں کر پھرے وہاں سے ترا نامہ بر فغاں

بوئے کبابِ سوختہ آتی ہے خاک سے
دامن سے کیا گرا کوئی لختِ جگر فغاں

یاں تک تو گرم ہے مرے خورشید رو کا حسن
دیکھے اگر کوئی تو نہ ٹھہرے نظر فغاں

مبتلائے عشق کو اے ہمدماں شادی کہاں — آگئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں

کوہ میں مسکن کبھی ہے اور کبھی صحرا کے بیچ — خانۂ الفت ہے ویراں ہم کو آزادی کہاں

ایک میں تو قتل سے خوش ہوں ولیکن تجھ سوا — بیٹھ جاویگی مرے قاتل پہ جلاّدی کہاں

کاش آجائے قیامت اور کھلے دیوانِ حشر — وہ فغاں جو ہے گریباں چاک فریادی کہاں

مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے — آ مرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے

کج کلہ۔ تیغ بکف۔ چیں بہ ابرو بیباک — یاالٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے

لئے جاتی ہے اجل جانِ فغاں کو اے یار — لیجیو تیرا گرفتار کہاں جاتا ہے

اشعار متفرق

دشتِ جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا — اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

دل بستگی قفس کی یہاں تک ہوئی مجھے — گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

سر کو فدائے خنجرِ فولاد کر چکا — پہونچا میں اپنی داد کو فریاد کر چکا

کیا تو شبِ فراق میں جیتا رہا فغاں — یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا

کہتا ہے یہ بہشت میں مستوں کی جا نہیں — زاہد کا کیا خدا ہے ہمارا خدا نہیں

پاؤں چلتے ہوئے دیکھے تو بیاباں کی طرف — ہاتھ اٹھتے ہوئے دیکھے تو گریباں کی طرف

ابھی مٹا نہیں دعویٰ ستم رسیدوں کا — کفن ہوا نہیں میلا ترے شہیدوں کا

بے سبب شمع کب جلے ہے فغاں — لطف سوز و گداز میں پایا

مجھ مبتلا کی چشم کہاں تک پُر آب ہو — اے دل خدا کرے ترا خانہ خراب ہو

بک گیا اب تو یہ دل کافرِ خونخوار کے ہاتھ — بندھ گئے رشتۂ الفت سے گنہگار کے ہاتھ

قاصد جو نا امید پھرا کوئے یار سے — خفت مجھے ہوئی دلِ امیدوار سے

ذکر کیوں غیر کا کرتے ہو فغاں کے آگے — انہی باتوں سے یہ کمبخت خفا ہوتا ہے

فہمی

شیخ دیانت حسین متخلص فہمی۔ ولد شیخ ہدایت علی۔ باشندہ مونگیر صوبہ بہار۔

شاگرد عبدالغفور نسّاخ۔ آپ ضلع بڑھیا مونگیر کے ایک اسکول میں مدرس تھے
فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

اللہ یہ اپنی بے کسی ہے ۔۔۔ رونے کو وہ سمجھتے ہیں ہنسی ہے
چہرے کی بلائیں لے رہی ہے ۔۔۔ کاکل تری مری مدعی ہے
سر پر کھڑی ہے قضا بھی وہ بھی ۔۔۔ جان اک عذاب میں پڑی ہے
مرتا ہے دراز کاکلوں پر ۔۔۔ فہمی کی حیات بڑھ گئی ہے

نہ وہ میں ہوں نہ وہ زمانہ رہا ۔۔۔ دل لگانے کا اب مزا نہ رہا
مدعی سے بگڑ گئی ہے ورنہ ۔۔۔ دل میں کیوں کچھ بھی مدعا نہ رہا
کی یہ اشک و حیا نے پردہ داری ۔۔۔ راز میرا ترا چھپا نہ رہا

آئینہ کو نہ مقابل رکھیں ۔۔۔ پہروں حیران رہا کیجے گا
تا بکے نالہ و افغاں فہمی ۔۔۔ کیا کہیں حشر بپا کیجے گا

بتوں کے جور و جفا نے کیا ہمیں گمراہ ۔۔۔ چلے ہیں دیر سے گھبرا کے خانقاہ کو ہم
اِدھر ہو جل کے جگر خاک اُدھر نہ ہو تاثیر ۔۔۔ ملائیں خاک میں فہمی بس ایسی آہ کو ہم

کہتے ہیں مجکو دیکھ کے اللہ رے فریب ۔۔۔ گر تم نہیں صحیح تو بیمار بھی نہیں
چشمانِ نیم وا تری اے مستِ خوابِ ناز ۔۔۔ گر خواب میں نہیں ہیں تو ہشیار بھی نہیں

جو ان سے پوچھئے غیروں پہ کیوں ہے لطف و کرم ۔۔۔ تو ہنس کے کہتے ہیں بس تیرے جلانے کو
ہوش کی اپنے دوا کیجئے کچھ خبر بھی نہیں ۔۔۔ آئے ہیں حضرتِ ناصح مجھے سمجھانے کو

حوروں ہی سے لگائیں گے دل کو کسی طرح
کوچہ تمہارا گر نہیں خلدِ بریں تو ہے

مجکو سوالِ بوسہ سے مطلب جواب ہے
گر ہاں نہیں زبان پر ان کے نہیں تو ہے

وہ بگڑی ہے ہوائے شہرِ الفت
جسے دیکھو وہ غم میں مبتلا ہے

وہ شکوہ اپنا مرے منہ سے سُنکر
لگے کہنے کہ ہاں کہیئے بجا ہے

ستم سے کم نہیں الطافِ یار اے فہمی
ہے برق جانِ حزیں طور مسکرانے کا

تمام عمر تو کسبِ کمال میں کاٹی
کیا کمال جو حاصل تو دل لگانے کا

اشعار متفرق

آپ کے غم میں مر گیا ہوں میں
اور کس طرح سے بنا ہوں میں

بے فائدہ گر عرش پہ پہونچے بھی تو حاصل
اے نالوں ذرا کان تک اس یار کے پہونچو

ہرگز نہ دمِ یارِ جفا کوشش میں آؤ
اے حضرتِ دل خیر ہے کچھ ہوش میں آؤ

جنازہ دیکھ کر میرا کہا حیف
رہی دل ہی میں سب حسرت جفا کی

قائم

نام محمد قیام الدین تخلص قائم باشندہ چاند پور متعلقہ سنبھل (مراد آباد) مقیم دہلی شاگرد میر درد و مرزا سودا ۔ ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا ۔ ایک دیوان و تذکرۂ شعرا آپ سے یادگار ہیں ۔

اشعار متفرق

کیوں چھوڑتے ہو دردِ تہِ جام میکشو
ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا

جہاں میں شہرہ تھیں مجنوں کی ذلتیں قائم
سو بارے عہد میں تیرے وہ نیک نام ہوا

تا بہ فلک نالہ تو پہونچا تھا رات
میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہو گا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائم
شائد اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

نہ وعدہ اس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی
اس سے جو کوئی جیا سو مر مر کر

گر زیست ہے تجھ تلک تو پھر کیا
صدقے ترے مر ہی جائیں گے ہم

دو جہاں بھی ملے تو بس ہے ہمیں
یہاں اتنی تو کچھ احتیاج نہیں

جب کہا عہد کیا کیا تھا رات
ہنس کے کہنے لگے کہ یاد نہیں

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور
یا ورنہ ہو تو لا ہیں ترے روبرو کروں

قائم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کے
اب کے جو میں نماز کروں بے وضو کروں

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

وہ بھی تو آدمی ہیں کہ جن سے تمہیں ہے ربط
کیا شکوہ تم سے روئیے اپنے نصیب کا

میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو
بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

کس دل پہ داغ غم نے نہ تیرے بہار کی
اللہ رے دھوم اب کے برس لالہ زار کی

بتوں کی دید میں جاتا ہوں دیر میں قائم
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

نہ نالے میں تاثیر ہے نہ آہ میں درد
معلوم ہو کس طرح تجھے چاہ کسی کی

گو بظاہر تو گلے ملتا نہیں میرے تو کیا
ہے تصور سے ترے ہر دم ہم آغوشی مجھے

دہن کو ترے پایا بات کہتے
ہماری خبر ہی میں کیا سخن ہے

قدر

سید غلام حسین متخلص قدر خلف میر خلف علی ساکن محلہ سلہیڑہ بلگرام (بہار) شاگرد سحر۔ ولادت ۱۸۳۳ء۔ آپ نے سحر کے بعد حضرت بحر اور مرزا غالب سے مشورہ سخن کیا۔ آپ ہردوئی اسکول میں مدرس تھے۔ اس کے بعد آپ بدل کر لکھنؤ آگئے اور کننگ کالج لکھنؤ میں مدرس ہوگئے آخری عمر میں یعنی ۱۸۹۳ء میں حضور نظام حیدر آباد نمائش کلکتہ میں تشریف لائے لوگوں نے قدر صاحب کو آمادہ کیا۔ اور آپ نے ایک قصیدہ غرا کہہ کر حضور نظام کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضور نظام جنت

چار سو روپیہ ماہوار پر آپ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا اور اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ قدر صاحب اوّل تو یہاں سے ہی بیماری کی حالت میں حیدر آباد گئے تھے مگر وہاں پہونچکر اور زیادہ بیمار ہوگئے۔ آخر آپ لکھنؤ واپس آگئے۔ یہاں آپ کا علاج چلتا رہا مگر جانبر نہ ہو سکے۔ آخر ۱۸۸۴ء میں انتقال فرماگئے جنازے کے ساتھ ہزاروں شاعروں کا ہجوم تھا اور سب کو آپ کے انتقال کا بڑا ملال ہوا آپ لاولد مرے ہیں۔

الٹ دیا وہ طبق زمیں کا پتا نہیں چرخِ ہفتمیں کا
بُرا ہو آہِ دلِ حزیں کا کہ مجکو رکھا نہیں کہیں کا

نشاں ہے یہ ابروئے حسیں کا اثر ہے یہ زلفِ عنبریں کا
کہ زخم اپنے دلِ حزیں کا ہے مشک نافہ غزالِ چیں کا

جو داغ ہے عشقِ دل نشیں کا جو دل نشیں ہے دلِ حزیں کا
وہی ہے تمغہ مری جبیں کا وہی سلیماں مرے نگیں کا

رہے گا قائل نہ تو کہیں کا نشاں رہے یہ بسملِ حزیں کا
غبار تو پونچھ لے جبیں کا لہو تو دھو ڈال آستیں کا

تڑپ نہ پوچھو دلِ تپاں کی کہوں میں تم سے کہاں کہاں کی
اسی سے ہے گردشِ آسماں کی اسی سے ہے زلزلہ زمیں کا

جو دم بخود ہوں لحد کے اندر ضرور ہوں کچھ نشان باہر
مزار پر سرمئی ہو چادر میں کشتہ ہوں چشمِ سرمگیں کا

نہ محبّتوں کا خیال پوچھو نہ میرے دل کا ملال پوچھو
نہ اگلے وقتوں کا حال پوچھو یہ آئینہ تھا کسی حسیں کا

میں اس کی سُنتا نہیں مزا ہے، وہ میری سُنتا نہیں بجا ہے
اِدھر بھی ہاں ہاں کا غل مچا ہے جو شور اُدھر ہے نہیں نہیں کا

کرے نہ کیوں یار ہم سے غرّہ وہ نور ہے خاک سے ہیں ہم
کہاں وہ سورج کہاں یہ ذرّہ کہ فرق ہے آسماں زمیں کا

یہ لاغری اب ہے خارِ دامن کہ اٹھ نہیں سکتا بارِ دامن
جو پاؤں اپنا ہے تارِ دامن تو ہاتھ ہے تارِ آستیں کا

سخن کو قدرِ اوج دے زباں سے کہ ختم انشاء ہو لامکاں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

ہوئے کارواں سے جدا جو ہم رہِ عاشقی میں فنا ہوئے
جو گرے تو نقشِ قدم بنے جو اٹھے تو بانگِ درا ہوئے

جو عدم سے چھوٹتے ہم اٹھے عجب انتشارِ فنا ہوئے
کہ بدن میں روح سما گئی تو غبارِ دوشِ ہوا ہوئے

کبھی داغ کھاتے ہی آہ کی کبھی آہ کرتے ہی رو دئے
کبھی ہم چمن کی ہوا ہوئے کبھی ہم گھٹا کی ہوا ہوئے

جو لہو تھا ان میں بھرا ہوا تو ہر اک زخم ہرا ہوا
یہ دل و جگر مرے کیا ہوئے کوئی تازہ برگِ حنا ہوئے

جو ہوا سے زلف ان کی بکھر گئی نظر صاف ان کی بدل گئی
جو اسیرِ حلقۂ ناز تھے وہ قتیلِ تیغِ ادا ہوئے

ہمہ تن ہوئے کبھی درد و غم ہمہ تن کبھی ہوئے صبر ہم
کبھی آپ اپنا مرض ہوئے کبھی آپ اپنی دوا ہوئے

بڑھی عمر تو ہوئے حشر وہ بڑھا قد تو ڈھائیں قیامتیں
بڑھیں پلکیں تو وہ ستم ہوئے بڑھیں زلفیں تو وہ بلا ہوئے

ترے ہاتھ جب سے لگا ہے دل تو جلانے ہیں دیا ہے دل
مرے زخمِ دل میں جو چور تھے وہ تمام دزدِ حنا ہوئے

اٹھے ہم جو خواب و خیال سے لگے تکنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اٹھے وہ کدھر گئے ابھی پاس تھے ابھی کیا ہوئے

نہ زمیں میں تخم اگر لگے تو کبھی نہ کوئی ثمر پھلے
وہ فنا میں اپنی بقا ہوئے جو بقا میں تیری فنا ہوئے
جو عدم میں تھے ہوئے خلق وہ جو وجود میں تھے وہ چل بسے
جو رہا تھے ہوگئے قید وہ جو اسیر تھے وہ رہا ہوئے
ہوا بعدِ وصل عجب مزا کہ خموش بیٹھے جُدا جُدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہوا ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے
بنے قدر ایسے غبار ہم ہوئے گردشوں میں وہ خوار ہم
کہ مثالِ دائرۂ فلک جو اٹھے تو بے سر و پا ہوئے

قلق

خواجہ اسد اللہ مخاطب بہ آفتاب الدولہ متخلص قلق ولد خواجہ بہادر حسین فراق باشندہ لکھنؤ شاگرد و ہمشیرہ زادہ خواجہ وزیر۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں ۱۸۷۰ء کے قریب انتقال کیا۔

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے معاملہ دل کا
الٰہی خیر ہو کچھ رنگ آج بے ڈھب ہے
تپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا
وہ رند ہوں کہ مجھے ہتھکڑی سے ہیبت ہے
ملا ہے گیسوئے جاناں سے سلسلہ دل کا
بہار آتے ہی کنجِ قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا
خدا کے ہاتھ ہے اب اپنا اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

کفر و اسلام کے جھگڑے سے چھٹے خوب ہوا
قیدِ مذہب سے جنوں نے ہمیں آزاد کیا
حسرتِ قتل ہی نے جان لی اپنی صد شکر
موت نے ہم کو نہ شرمندۂ جلاد کیا

اشعار متفرق

ابھی چمن میں ہوں آنکھیں نہ بند کر صیاد
حذر کر آہ سے میری خدا سے ڈر صیاد
کبھی مجھکو کبھی غیروں کو لگا لیتی ہیں
خوب سیکھی ہیں لگاوٹ کے اشارے آنکھیں

چوکتا ہی نہیں ہے تیر نگاہ
قدر انداز ہے غضب کی آنکھ

ہونٹوں میں داب کر جو گلوری دی یار نے
کیا دانت پیسے غیر نے کیا کیا چبائے ہونٹ

چھڑا کر یار سے کیا تفرقہ ڈالا ہے گردوں نے
نہ وہ چرچے نہ وہ چہلیں نہ وہ جلسے نہ صحبت ہے

کہاں تک ایڑیاں رگڑوں گلا کاٹو گلا کاٹو
اٹھا لیجے نہ خنجر باز آیا ایسے ترحم سے

اس پہ مرتے ہیں کرے تازہ جو بیداد کوئی
ہم ستم سہتے ہیں گر ہو ستم ایجاد کوئی

ہم نے احسان اسیری کا نہ برباد کیا
مرتے دم منہ طرف خانۂ صیاد کیا

قلق نصیب ہو کیا سیر باغ بے کھٹکے
عدو تے یہاں ہے ادھر باغباں ادھر صیاد

اپنے سوار قیب کی کب دال گلتی ہے
باتیں بنائے لاکھ وہ شیخی بگھار کے

دون کی لے جب کبھی گانے کی فرمائش کروں
ایک اس کو لن ترانی کا ترانہ یاد ہے

قوس

نام مرزا محبوب علی تخلص قوس ولد مرزا ہمایوں بخش ابن زین العابدین۔ شاگرد عبد الغفور نساخ۔ آپ کانپور میں پیدا ہوئے مگر کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ شروع میں شمش تخلص فرماتے تھے مگر بعد میں اسے تبدیل کر کے قوس اختیار کر لیا۔

رات دن رہتا ہے ہم پہلوئے دلبر آئینہ
پا گیا بخت عدو اے دل مقرر آئینہ

زانوئے خوباں پہ رہتا ہے برابر آئینہ
بخت بد رکھتا ہے کیا سیدھا مقدر آئینہ

جو حسیں ہے اس کے دل میں کرتا ہے گھر آئینہ
جانتا ہے بس عمل سب کا مقرر آئینہ

بخت خفتہ بدلوں میں آج جاگا صبح دم
ہم سے مانگا یار نے بیدار ہو کر آئینہ

جب طلب بوسہ کیا ان سے تو ہنس کر یہ کہا
منہ تو اپنا دیکھئے صاحب اٹھا کر آئینہ۔

معجزہ حضرت عیسیٰ کا دکھا دیتے ہیں
بات کی بات میں مردے کو جلا دیتے ہیں

جب میں کہتا ہوں کہ کب عدہ وفا کیجے گا
ہنس کے شوخی سے وہ انگوٹھا دکھا دیتے ہیں

کیا ادا ہے کہ میں کشتہ ہوں اسی کا اے قوس
لیکے خمیازہ وہ چٹکی جو بجا دیتے ہیں

گرمیاں جو مجھ سے کیں اس شمع رو نے بزم میں
غیر مارے شرم کے جل جل کے ٹھنڈا ہو گیا

جان کھا جاتا ہے غم آسان سمجھے تھے اسے
دل لگانا قوسؔ کا منہ کا نوالا ہو گیا

اشعار متفرق

مرنے پہ بھی جلاتا ہے اس کو قوسؔ
بنوایا ہے چراغ جو میرے غبار کا

نہ سنورا ایک بھی کام اپنے دل کا تجھ سے اے ظالم
ترے ہاتھوں سے ہر دم کام اپنا اے چرخ کہن بگڑا

خدا دیتا ہے بعد از رنج پھر راحت ضرور اے دل
وصال اپنا ہوا صدمہ سہا جب درد ہجران کا

نقش پائے یار کے سودے کا یہ دیکھا اثر
رات بھر ہے چاند گردش میں تو دن بھر آفتاب

جان دی ہے عشق میں اس گل کے میں نے ہم صفیر
پھول لا کر کیوں نہ تربت پہ چڑھائے عندلیب

تل نہیں ہے تیغ زن یہ ابروئے خمدار پر
جم گیا ہے خوں کا قطرہ تیغ جوہر دار پر

قہر کا آفت لگا سرمہ نگاہ یار میں
اور دونی ہو گئی ہے آب اس تلوار میں

جو کبوتر اس نے دیکھا نامہ بر سمجھا مرا
مار ڈالے ہائے دھوکے میں کبوتر سینکڑوں

ان حسرتوں کو لیکے سماؤں گا کس طرح
اے جان کچھ ایسی وسعت کنج عدم نہیں

سویا پہلو میں مرے وہ ماہ پیکر رات کو
مدتوں میں ہمنشیں جاگا مقدر رات کو

تمہارے حسن نے سب کو تو گمراہ کر ڈالا
یہودی کو مجوسی کو نصاری کو مسلماں کو

زانوئے دلدار اور تصویر پشت آئینہ
واہ واری واہ وا تقدیر پشت آئینہ

جو بات سچ ہے کہدوں میں منہ پر ہزار کے
گل تک فریفتہ ہیں مرے گلعذار کے

مگر اس شعلہ رو کی ہے و لیکن
مثال سایۂ احمد نہاں ہے

جب نزع میں نہ آئے تو مرقد پہ آچکے
وہ شمع و گل مزار پر مرے چڑھا چکے

ہوئے پامال لاکھوں اس ادا سے
چلے جو ناز سے دامن اٹھا کر

شہرہ چتون میں ہے گر موئے میان یار کا
شوخ چشمی کی غزالان ختن میں دھوم ہے

مے کشی کا ہے اشارہ جلد لا ساقی شراب
جانب قبلہ سے اٹھی ہے گھٹا برسات کی

چلتا ہے رک رک کے کن انکھیوں کی چال سے
خنجر قاتل میں بھی رفتار معشوقانہ ہے

لاش پر آئے منہ چھپائے ہوئے
شرم اب تک تمہاری نہ گئی

مجھ سے وحشی کو جو سمجھاتے ہو واللہ
آپ تو تجکو نظر آتے ہیں دیوانے سے

میری صحبت میں نہ آیا کریں غیر
باتوں باتوں میں سناتے ہیں مجھے

گویا

نام حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں متخلص گویا۔ خلف بلند خاں قوم آفریدی شاگرد خواجہ وزیر۔ آپ لکھنؤ کے امرائے نامی تھے صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

ملی ہاتھوں میں یہ حنا کس نے
خون سر پر مرا لیا کس نے

صبح کو شام کر دیا کس نے
زلف میں منہ چھپا لیا کس نے

کاش سر تن سے وہ جدا کرتا
کر دیا یار سے جدا کس نے

پاؤں پڑنے سے جو خفا ہوتا
ہاتھ سے میرے کھو دیا کس نے

تو نے مارا جسے کیا احسان
تجھ سے مانگا ہے خوں بہا کس نے

زیست پر ناز میری موت کو ہے
کر دیا کشتۂ ادا کس نے

یار دیتا ہے مے نہیں پیتا
کیا گویا کو پارسا کس نے

تم وفا کا عیوض جفا سمجھے
اے بتو تم سے اب خدا سمجھے

پان کھا کر جو آئے مقتل میں
کیا شہیدوں کا خوں بہا سمجھے

ہو گیا جب قلم ہمارا سر
اپنی قسمت کا تب لکھا سمجھے

دوڑے کیا ہو کے خوش سوئے مقتل
اس کے گھر کا ہم راستہ سمجھے

یاد دنداں میں جو بہا آنسو
اس کو ہم دُرّ بے بہا سمجھے

چاندنی پر وہ کیوں رکھے نہ قدم
ہم فقیروں کا بوریا سمجھے

تیرے ابرو کو جو ہلال کہا
ماہ نو سے بھی کچھ سوا سمجھے

ہاتھ اٹھا کر لگا جو کوسنے وہ
واہ رے ہم اسے دعا سمجھے

اپنے بھید پوچھ مت گویا
کچھ نہ سمجھے یہ یار دل سمجھے

پاس غیروں کے جب وہ جا بیٹھے
ہاتھ دُنیا سے ہم اٹھا بیٹھے

یاد میں جس کی اک جہاں بھولے
وہ ہمیں صاف ہی بھلا بیٹھے

دل لیا جان لو جگر بھی لو
کس لئے پھر ہو تم خفا بیٹھے

دیکھیں لاتی ہے کب شمیم زلف
منتظر ہیں ترے ہم صبا بیٹھے

میں نے گل کھایا تو لگا کہنے
خوب تازہ یہ گل کھلا بیٹھے

نہ اٹھیں گے مثالِ نقشِ قدم
جب ترے در پہ یاد آ بیٹھے

دیکھ اس سے سمجھ کے کرنا بات
ہے وہ گویا نہ کچھ سنا بیٹھے

جو وہ اپنی محرابِ ابرو دکھا دے
بشر کیا فرشتہ بھی گردن جھکا دے

اثر کچھ تو اے آہِ سوزاں دکھا دے
رقیبوں کے دو چار گھر تو جلا دے

میں منصور ہوں زاہد و حق کہوں گا
اگر کوئی سولی پہ مجھکو چڑھا دے

بھلا کچھ تو آ کام اے جوششِ گریہ
کہ غیروں کے دیوار و در کو گرا دے

اجل کہہ کے اس تیغِ ابرو کا قصّہ
ہے احساں شبِ ہجر میں گر سلا دے

پڑھے کب وہ گویا بھلا میرے خط کو
کبوتر کو جو چٹکیوں میں اڑا دے

حیرت میں بھی جاری تھے مری آنکھ سے آنسو
یہاں قطرۂ شبنم گل تصویر سے ٹپکے

یہ دستِ حنائی میں لیا کس نے مرقّع
جو قطرۂ خوں دیدۂ تصویر سے ٹپکے

پیدا گلِ خورشید ہو واں یا گلِ مہتاب
جس جا کہ پسینہ رخِ بے پیر سے ٹپکے

اے جوششِ گریہ جو ڈبویا ہے زمیں کو
یہ شفقتِ فلک بھی کسی تدبیر سے ٹپکے

مینائے گلو کا جو کروں وصف میں گویا
قلقل کی طرح سے مری تقریر سے ٹپکے

یہ اک تیرا جلوہ صنم چار سو ہے
نظر جس طرف کیجئے تو ہی تو ہے

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

کبھی رُخ کی باتیں کبھی گیسوؤں کی — سحر سے یہی شام تک گفتگو ہے
پلا دے لبِ جام کو لب سے ساقی — چمن ہے ہوا سرد ہے آبجو ہے
نہیں چاک دامن کہیں مجھ سا گویا — نہ بخیے کی خواہش نہ فکرِ رفو ہے

اس کو غفلت پیشہ کہہ آتے ہیں ہم — بھول جانا یاد دلواتے ہیں ہم
ضعف سے رہتا ہے اب پاؤں پہ سر — آپ اپنی ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم
ہے جنازہ اس لئے بھاری مرا — حسرتیں دل کی لئے جاتے ہیں ہم
بارِ عصیاں سر پہ ہے گویا بہت — کیا اٹھائیں سر جھکے جاتے ہیں ہم

اشعار متفرق

صندلی رنگ پہ میں مر ہی گیا — دردِ سر کس کا یہاں سر ہی گیا
وہ ایسا نہیں چپ رہے بات سنکر — کوئی اور ہو ویگا گویا نہ ہوگا
تھا جو افتادگی شعار اپنا — نہ زمیں سے اٹھا غبار اپنا
پس گیا ہے دل کسی محبوب گندم رنگ پر — گردش اپنے بخت کی کچھ آسیا سے کم نہیں
وصل گر منظور تھا پرویز کا گھر کھودتا — کوہکن دیوانہ ہے شیریں تو پتھر میں نہیں
زاہد وجرم کیا کرتا ہوں میں بہرِ ثواب — دل ہے کعبہ اسے کرتا ہے سیہ پوش مجھے
مالِ عاشق و معشوق ہے ایک — سُنتا ہے شمعِ سوزاں کی زبانی

مجروح

مولوی حمید النبی تخلص مجروح باشندہ رامپور برادرِ خُرد و شاگرد مولوی رشید النبی وحشت۔ آپ نے کچھ روز کلکتہ میں بھی قیام کیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۱۸۶۳ء کے قریب اپنے وطن میں جا کر رحلت کی۔

سودا سرِ جعدِ یار کا ہے — سر پہ مرے سایۂ ہما ہے
کیا فوجِ الم سے دغدغہ ہے — جوشن مجھے نقشِ بوریا ہے
دل مانگنے کے ہیں یار لٹکے — وہ کاکلِ مشکبو بلا ہے

باقی نہیں آہ تک بھی ہمدم
یاں عالم دل میں اب خلا ہے
وابستہ ہے کاکلوں سے آزاد
اس دام میں جو رہا رہا ہے
رکھا تہہ تیغ ہم نے سر کو
یہ سجدۂ شکر بے ریا ہے
رہتا ہے یہ چرخ میں شب روز
مجروح فلک کا سر پھرا ہے

گردش بخت سے ہے چرخ مجھے
کیا گلہ دورِ آسمانی کا
چشم مردم کہاں کہاں وہ جمال
ہے بجا شور لن ترانی کا
بوسۂ لب پہ دیتے ہو دشنام
تم کو لپکا ہے بدزبانی کا

چال بجلی کی نہ گورِ شہیداں پر چلئے
کشتۂ ناز ہر اک قبر میں مضطر ہوگا
چرخ چڑھنے سے نہیں داغ غلامی مٹتا
ماہ کس منہ سے ترے چہرے کے ہمسر ہوگا
وادیِ شوق میں بتلاؤں گا میں خضر کو راہ
دل مرا منزلِ مقصود کا رہبر ہوگا

تلوار سے خوں کا مرے دھبّا نہیں جاتا
یہ لال نشیمن سے اڑایا نہیں جاتا
خط آنے سے بھی زلف کا سودا نہیں جاتا
کالا ترا کالے سے بھی کیلا نہیں جاتا
ہے آتش یاقوت سے جو پیاس بجھانی
یاں بوسۂ لب کا کبھی لپکا نہیں جاتا

ٹیکا ہو ترے ماتھے پہ عکس مہ تاباں
بے پردہ شب مہ میں اگر تو نکل آئے
ہر موج بنے مار سیہ زہر الم سے
دریا سے جو تم زلف سنوا لے نکل آئے

پانی نہ ہو کیونکر کرۂ آب میں پانی
بھر آئے جو اس دیدۂ بے خواب میں پانی
دل صاف جو ہیں ان میں کدورت نہیں ہوتی
ممکن نہیں مخلوط ہو سیماب میں پانی

منکرِ روزِ قیامت ترے کوچہ میں آئیں — روز ہوتا ہے بپا محشر تری رفتار سے

مست

حکیم اشرف علی تخلص مستؔ۔ شاگرد حافظ اکرام احمد ضیغمؔ رئیس سلہٹ۔
آپ طبی رسالوں کے مدیر تھے۔ فنِ طب اور فنِ کشتی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔

آج دلبر کو خواب میں دیکھا — نورِ حق کا حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا — یہ تماشا حباب میں دیکھا
آپ کو سوختہ غیر کو لذت — یہ مزہ ہم کباب میں دیکھا
بیٹھ کر سیر ملک کی کرنا — یہ تماشا کتاب میں دیکھا
اک پیالے میں مستؔ ہو جانا — یہ تماشا شراب میں دیکھا

اک طوق ہے اور دوسری زنجیر گلے میں — پہناتی ہے کیا آگے کو تقدیر گلے میں
واں پاؤں حنا پڑتی ہے، آنا ترا معلوم — ہم جا نہیں سکتے ہیں کہ ہے زنجیر گلے میں
پھرتا ہے مجھے کھینچے ہوئے رشتۂ الفت — ہے طوق گرانبار نہ زنجیر گلے میں
سکانی ہیں اس سادگی پر گردنیں لاکھوں — ہیکل ہے نہ جگنو ہے نہ زنجیر گلے میں

تم بک دو اگر ہم سے تو پھر دیکھنا اے یار — ٹھہرائے ہیں جو دل میں سو کر جاتے ہیں کیسے
یا کانہ رقیبوں کا نہ درباں کا کھٹکا — اس کوچہ میں بے خوف و خطر جاتے ہیں کیسے
یا مستؔ کو بے وصل تھی اک آن قیامت — یا برسوں جدائی میں گزر جاتے ہیں کیسے

اشعار متفرق

عجز نے میرے اڑایا آپ کے دل کا غبار — خاکساری میں اثر ہے سرمۂ تسخیر کا
چادرِ مہتاب پر گر پڑ گیا اس کا قدم — پھر دماغِ ماہِ تاباں عرش پر ہو جائے گا
رات دن یوں جو تڑپتا ہے مثالِ بسمل — کس نے مارا تجھے اے مستؔ کہاں پر مارا
الٰہی بارِ عصیاں سے گرانبار اس قدر ہوں میں — یقیں ہے ٹوٹ جائے حشر میں پلہ ترازو کا

کیا بختِ واژگوں سے ہوا قلب ماہیت　　دشمن ہماری جان کے ہیں دوستانِ دوست

رکھتے ہیں کھولکر وہ کڑے ہاتھ پاؤں کے　　رہتے ہیں وصل میں سرِ بستر ہلال چار

کیا سچ مثل ہے داشتہ آید بکار بھی　　آخر نہ کام آگئے شبہائے تار داغ

شاید کہ اضطراب نے میرے اثر کیا　　ہیں ان دلوں تو آپ بھی کچھ بے قرار سے

اے مست یہ کیا تو نے کیا تیرا برا ہو　　دل اس لیے دیں کو دیا جان کے بدلے

مسرور

نام سید محمد علی تخلص مسرور ولد سید علی طباطبائی۔ نواسہ میر شیر علی افسوس۔ باشندہ کلکتہ شاگرد عبدالغفور نساخ۔ آپ نے ایران۔ رنگون، پنجاب وغیرہ بہت سے ممالک اور شہروں کی سیر کی ہے۔ عہدِ شباب میں ۱۸۶۳ء میں انتقال کیا۔

دل اور پھر گیا ہے اس بدگماں کا　　تاثیرِ آہ دیکھی دیکھا اثر فغاں کا

مشکل ہماری کیسی آسان ہجر میں کی　　احساں مانتے ہیں ہم مرگِ ناگہاں کا

کان تک اس کے پہونچتی مری فریاد نہیں　　بھول جانے کے سوا کچھ بھی اسے یاد نہیں

ظلم کرتا ہے جفا کرتا ہے رلواتا ہے　　کونسی طرزِ ستم ہے جو اسے یاد نہیں

کس لئے لڑنے کو تیار ہے تو عاشق سے　　تو تو انسان ہے اے یار پریزاد نہیں

دل کو ہے میرے یار کی تحریر کا خیال　　شنجرف کا ہے خط ورقِ آفتاب میں

مضمون میرے شعر کا کیا سمجھیں گے کور دل　　ہوتا ہے نور بھی کہیں چشمِ رکاب میں

مسرور کو بچا ہو دوزخ کی آگ سے　　یہ عرض ہے جنابِ رسالت مآب میں

پھونکتی ہے گوشِ گل میں روز کچھ کچھ آکے وہ　　کیوں نہ ہو صیاد پر ثابت خطائے عندلیب

عاشق اپنی جان معشوقوں پہ کرتے ہیں نثار　　کیوں نہ عشقِ گل میں جان اپنی گنوائے عندلیب

جب کہ کھولا اس پری پیکر نے اپنی زلف کو — اس کی خوشبو سے مکاں سارا معطر ہو گیا
ان دنوں شکلِ عروسی ہے صنم کے ہجر میں — صورتِ عکسِ مثلث جسم لاغر ہو گیا

اشعار متفرق

بزم مے میں یار ساقی نے یہ کیفیت دکھائی — دیدۂ جام ہے گلگوں بھی گریاں ہو گیا
لبِ رنگیں کا ترے وہ اثر پھیلا ہے عالم میں — جگر خوں ہو گیا ہے لعل کا کوہِ بدخشاں میں
وفا گل میں ہے نہ نالۂ بلبل میں اثر — باغِ عالم کی ہوا اے گلِ رعنا بدلی

مسلسل

نام شیخ وزیر علی تخلص مسلسل۔ خلف شیخ زائر علی عرف رمضان علی شاگرد عبدالغفور نساخ - آپ مونگیر میں رہتے تھے۔

جب میں نے کہا وصل کا وعدہ نہیں کرتے — جھنجھلا کے خفا ہو کے وہ بولا نہیں کرتے
کیا جانیے کیا دل میں ہے اب ان کے سمایا — وہ ناز وہ غمزہ وہ اشارا نہیں کرتے
ان سے بھی کبھی ذکر نہیں آتا ہے اس کا — ہم رازِ شبِ وصل کو رسوا نہیں کرتے

آنکھوں میں سرمہ لگائیں اور گلوری کھائیں آپ — عاشقوں کے قتل کی تدبیریوں فرمائیں آپ
بوسہ بے مانگے عدو کو دیں یہ ہے نیرنگِ عشق — اک بوسہ کی طلب پر مجھ سے یوں جھنجھلائیں آپ
خیر تو ہے مجھ سے سودائی کو سمجھانے لگے — حضرتِ ناصح سمجھ کر بات کو فرمائیں آپ

کہاں حور اور کہاں زاہد ہے عقل — عبث بیدار رہتا ہے سحر تک
ترے ہنگامِ رخصت کا کسے خوف — دیکھیے گا جو جیے گا سحر تک

دیکھ لینا تو قفس کو مرے شاخِ گل پر — فصلِ گل رہ گئی صیاد جو پر ہونے تک
آہ وحشت کی مسلسل جو کوئی راہ نہیں — سر کو ٹکرائیے دیوار سے در ہونے تک

دل اس کا ہے اگر رُخِ اغیار کی طرح
ملتی ہے مرے دل سے رُخِ یار کی طرح

دشوار ہے نظارہ اشارہ محال ہے
دشمن کھڑے ہیں بیچ میں دیوار کی طرح

اشعار متفرق

لکھا ہے حضرتِ دلِ مرحوم کا جو حال
ہر لفظ میری بیت کا ماتم سرا ہو

اللہ رے کوچہ گردیِ جاناں کا حوصلہ
جب پاؤں تھک گئے تو پھرا سر تمام رات

لیلیٰ کو اپنی سمجھے ہے کالی بلا کوئی
دیکھے جو قیس آپ کو میری نظر سے آج

شاید ہے یہ گمان کہ نکلے نہ کوئی عیب
آئینہ دیکھتے ہیں تو میری نظر سے وہ

خموشی کو سمجھو وعدۂ وصل
کہیں گے وہ زباں سے اپنی کب

مصحفی

نام شیخ غلام ہمدانی۔ تخلص مصحفی خلف شیخ ولی محمد ولادت ۱۱۶۴ھ
آپ امروہہ ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ عالم شباب میں دہلی چلے آئے اور مولوی مستقیم سے تحصیل علم کیا۔ طبیعت میں موزونیت خدا داد تھی لہذا شعر و شاعری کی طرف مائل ہوگئے شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ اہلِ دہلی آپ کا سکہ مان گئے۔ جب دہلی تباہ ہوئی اور اہلِ کمال کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو آپ دہلی سے نکل آئے اور چندروز ٹانڈہ ضلع مراد آباد میں رہے اور نواب احمد یار خاں سے تنخواہ پاتے رہے۔ نواب صاحب کا کھیل بگڑ جانے کے بعد آپ لکھنؤ چلے آئے اور کچھ روز یہاں رہ کر پھر دہلی چلے آئے لیکن آب و دانہ کی کشش پھر لکھنؤ کھینچ لائی اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ یہاں میر انشا سے شعر و شاعری میں بڑی معرکہ آرائیاں رہیں۔ آپ مسلم الثبوت استاد اور کثیر گو شاعر تھے۔ آپ کے آٹھ دیوان شائع ہوئے اور ہزاروں شعر دوسرں لوگوں کو دیدیئے ۱۸۲۴ء ۱۲۴۰ھ میں وفات کی۔

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لیکر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لیکر

جی ہی جی بیچ بہت شاد ہوا کرتی ہے
تیرے عارض کی بلائیں تری مژگاں لیکر

کیا خطا مجھ سے ہوئی رات کہ اس کافر کا
میں نے خود چھوڑ دیا ہاتھ میں داماں لیکر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لیکر

طرفہ سوجھی یہ جنوں کو ترے دیوانہ کی
راہ میں پھینک دیئے خارِ مغیلاں لیکر

زلف و رخسار کا عالم ہے غضب ہی اس کے
شاد ہو کیوں نہ دلِ گبر و مسلماں لیکر

ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لیکر

پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لیکر

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا درِ قبر
دوش پر نعش مری گبر و مسلماں لیکر

مصحفیؔ گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث تختِ سلیماں لیکر

فانش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے
دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے یہ شدّت
واللہ کہ وہ شخص ہے مجنوں مرے آگے

فقا نہیں خاطر میں سخن بیہودہ گو کا
اعجازِ مسیحا بھی ہے افسوں مرے آگے

دشوار ہے رتبہ کو پیمبر کے پہنچنا
ہے موسیٰ عمراں بھی ہاروں مرے آگے

باندھے ہوئے ہاتھوں کو بہ امیدِ اجابت
رہتے ہیں کھڑے سینکڑوں مضموں مرے آگے

جب موج پہ آجائے ہے دریائے طبیعت
قطرہ سے بھی کم ٹھہرے ہے جیحوں مرے آگے

اُستاد ہوں میں مصحفیؔ حکمت کے بھی فن میں
ہے کودکِ نو درس فلاطوں مرے آگے

شیشۂ مے جو نہ ہو ہم نفسِ جامِ شراب
دل سے مستوں کے نہ نکلے ہوسِ جامِ شراب

سایۂ خالِ ذقن ہے مگسِ جامِ شراب
کیونکہ اس مست کو ہو پھر ہوسِ جامِ شراب

چاہیئے خونِ جگر اپنا وہ پی کے رہ جائے
ہو نہ مفلس کو اگر دسترسِ جامِ شراب

تشنگی سینہ جلاتی ہے جو مخموروں کا
آب بھی ان کو پلاتے ہیں لبِ جامِ شراب

چشم و مژگاں پہ کرے اس بُتِ کافر کی نظر
گر نہ دیکھا ہو کسی نے قفسِ جامِ شراب

ابھی انگور میں تھا بادہ کہ مستوں کا ہوا
طائرِ روح اسیرِ قفسِ جامِ شراب

یہ بھی نیا جنوں ہے کہ کانٹوں سے چھوٹ کر
روئے ہم آبلہ کی طرح پھوٹ پھوٹ کر

اس آہِ شعلہ بار کو یارب یہ کیا ہوا
اک بار رہ گئی جو ہوائی سی چھوٹ کر

مدت سے اپنا کشورِ دل بے چراغ ہے
کیا جانے لے گیا ہے اسے کون لوٹ کر

تو مصحفی کے دل کو پٹکنا نہ ہاتھ سے
وہ آئینہ نہیں کہ بنے پھر ٹوٹ کر

اس کا یہی سبب ہے جو گرمِ فغاں نہیں
میرا تو اس چمن میں کوئی ہمزباں نہیں

عاشق ہوں لیک صحبتِ معشوق سے نفور
بلبل ہوں پر چمن میں مرا آشیاں نہیں

اٹھتے ہیں آج ناقۂ لیلیٰ کے جلد پاؤں
سرگشتہ کیا کوئی عقبِ کارواں نہیں

ماندگی میں کیا ہو منزل پر پہونچنے کی امید
کس طرح پہونچے جو کوسوں کارواں سے دور ہو

قصۂ دردِ غریبی اس سے پوچھا جائیے
موسمِ گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو

پردہ اٹھے یا نہ اٹھے اس کے چہرے سے مگر
یہ حجابِ چشم یارب درمیاں سے دور ہو

تصوف

معشوق ہوں عاشقِ معشوق نما ہوں
معلوم نہیں مجکو کہ میں کون ہوں کیا ہوں

ہوں شاہدِ تنزیہ کے رخسار کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں

ہستی کو مری عالمِ ہستی نہ سمجھنا
ہوں ہست مگر عالمِ ہستی سے جدا ہوں

انداز ہیں سب عاشق و معشوق کے مجھ میں
سوزِ جگر و دل ہوں کبھی ناز و ادا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گل و صبح معطر
میں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں

گوشِ شنوا ہو تو مری رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں

یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند کہ خود عقدہ و عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہرِ انوارِ خدا ہوں

اشعار متفرق

انگڑائی لیکے اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجکو مار ڈالا

عید کی شب کی رچی مہندی تھی ورنہ اس کا ہاتھ　یہ بجز خورشید محشر سے بھی بیعت مانگتا

وقت خلوت وہ یہ کہتا ہے کہ میں کہہ دوں گا　تو لئے ہاتھوں سے مرے منھ کو اگر بند کیا

اے مصحفی بتوں میں ہوتی ہے یہ کرامت　دل پھر گیا نہ تیرا آخر خدا سے دیکھا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم　تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ہمارے ہاتھ میں آئے کبھو نہ یا قسمت　کہ پاؤں پر ترے مہندی کا اختیار رہا

بیٹھے بیٹھے جو ہو گیا وہ کھڑا　اک ستارہ سا شب زمیں سے اٹھا

ہم کو ترساتے ہو کیوں یہ اداد کھلا کر　منھ چھپایا نہ کرو بہر خدا دکھلا کر

تم مصحفی کو چھوڑ کے بسمل چلے گئے　فرصت خیال نے اتنی نہ دی پھر کے دیکھ لو

چشم بد دور تری چشم سیاہ　آفت روز گار ہیں دونوں

آتا نہیں اس ڈر سے میں شمشیر تلے بھی　احسان کسی کا مری گردن پہ نہ ہووے

مضمون

نام شیخ شرف الدین تخلص مضمونؔ۔ آپ کا خاص وطن جاجمؤ (آگرہ) تھا۔ مگر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سراج الدین علی خاں آرزؔو جو مسلم الثبوت استاد تھے ان سے آپ کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ حالانکہ آرزؔو صاحب مضمونؔ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ آپ نے ۱۱۶۷ھ میں وفات کی۔ آپکا کلام بہت کم دستیاب ہے۔

اشعار متفرق

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا　صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

کرے ہے دار بھی حق کو سر تاج　ہوا منصور سے عقدہ یہ حل آج

ہمارا اشک قاصد کی طرح ہرگز نہیں تھمتا　دل بیتاب کا شاید لئے مضمونؔ جاتا ہے

تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر　آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال

نہیں ہیں ہونٹ ترے پان سے سرخ　ہوا ہے خوں مرا آکے لبریز

خط آگیا ہے اس کے مری ہے سفید ریش　کرتا ہے اب تلک بھی وہ ملنے میں شام صبح

میکدہ میں گر سراپا فعل نامعقول ہے　مدرسہ دیکھا تو وہاں بھی فاعل و مفعول ہے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب آتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے
یہی غنچہ کے دل میں پھلجھڑی ہے

مظہر

نام مرزا جان جاناں تخلص مظہر باشندہ دہلی۔ آپ کے والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ ابھی آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیس سال کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جاروب کشی کرتے رہے اور اہل علم سے حدیث اور مذہبی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آپ کا رجحان چونکہ تصوّف کی طرف ہو گیا تھا لہذا آپ فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے اور ہزاروں لوگ آپ کے مُرید ہو گئے۔ آپ زیادہ تر فارسی زبان میں کلام کہتے تھے اور اردو میں کم۔ آپ کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر۔ حزیں۔ اور خواجہ حسن اللہ بیاں مشہور اُستاد ہوئے ہیں ۱۷۸۱ء میں آپ ایک شخص کے ہاتھوں قتل کر دئے گئے تھے۔

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے کی زندگی کٹتی
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رُسوا
ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانجاں اپنا

اس کو تو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لکھا ہے چمن میں ہوا کے ہاتھ

برگِ حنا پہ لکھوں ہوں احوالِ دل مرا
شاید کبھی تو جا لگے اس دلربا کے ہاتھ

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
بینا لگا ہے جب سے تجھ بے نوا کے ہاتھ

ڈرتا ہوں میرزائی تری دیکھ ہر سحر
سورج کے ہاتھ جوڑتے دیکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اس تئیں
یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
نہیں آتا ہے اسے تکیہ پہ آرام
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے کہ موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ سے
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بُلاتی ہے بہار

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

اشعار متفرق

اگر ملیے تو خفت ہے اگر دوری قیامت ہے
غرض نازک مزاجوں کو محبت سخت آفت ہے
الٰہی کب کسو کے بیش رنجِ انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آئے
نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں یہاں کس میرا
کہیں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا
توفیق دے کہ شور سے اکدم وہ چپ رہے
آخر مرا یہ دل ہے الٰہی جرس نہیں

معروف

نواب الٰہی بخش خاں دہلوی تخلص معروف۔ برادرِ خُرد فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر رئیس جھرکہ خلف مرزا عارف جان۔ شاگرد شاہ نصیر دہلوی۔ آخری ایام میں آپ تارکِ دنیا ہو گئے تھے بلا ۱۸۲ سنہ میں انتقال کیا۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

جب تک میں جیتا ہوں طلبگار ہوں تیرا
تو بیچ بھی ڈالے تو خریدار ہوں تیرا

سو بار میں اس روز کے قربان ہوں ہر بار
جس روز کے قربان میں یکبار ہوں تیرا

جوں نقشِ قدم وا نہ رہے کیونکہ مری چشم
حیرت زدہ جلوۂ رفتار ہو لے تیرا

اظہارِ محبت تو ہوا واقعی مجھ سے
جو چاہے سو کر مجکو گنہگار ہوں تیرا

کس شکل سے عالم کو نہ ہو میرا تماشا
میں محوِ تماشا سرِ بازار ہوں تیرا

مرہم کا وہ خواہاں ہو جو ہو تیغ کا گھائل
اے ابروئے جاناں میں دل افگار ہوں تیرا

جو بندہ یا بندہ ہے معروف جہاں میں
جب تک کہ میں جیتا ہوں طلبگار ہوں تیرا

میں رنجِ محبت کبھی راحت سے نہ بدلوں
عیشِ دو جہاں اس کی مصیبت سے نہ بدلوں

تجھ سے کبھی یوسف کو اگر بدلے زلیخا
زنداں میں پڑوں پر کسی صورت سے نہ بدلوں

یہ رنگِ رخِ زرد جو اب دیکھو ہو میرا
قاروں بھی اگر بدلے تو دولت سے نہ بدلوں

گر لاکھ کوئی مجھ پہ قیامت کرے برپا
تو بھی ترے قامت کو قیامت سے نہ بدلوں

اس عشق کی رسوائی میں ہے یہ مری عزت
حرمت سے کوئی بدلے تو حرمت سے نہ بدلوں

دے خضر اگر چشمۂ حیواں بھی تو ہرگز
واللہ تری چشمِ عنایت سے نہ بدلوں

جنت کو اگر بدلے کوئی اس کی گلی سے
مر جاؤں ولے تو بھی میں جنت سے نہ بدلوں

معروف مرے پاس ہے وہ گنجِ قناعت
سکندر و دارا کی بھی شوکت سے نہ بدلوں

عشق کا سا کبھی آزار نہ دیکھا نہ سنا
اس کا جیسا کوئی بیمار نہ دیکھا نہ سنا

مجھ کو جس بزم میں زنہار نہ دیکھا نہ سنا
ناچ اور راگ وہاں یار نہ دیکھا نہ سنا

ہمدمو میں نے کبھی ردِّ کلامِ واعظ
اس کے جز مصحفِ رخسار نہ دیکھا نہ سنا

نرگس گل نے اسی باغِ جہاں میں تجھ سا
چشم اور گوش سے اے یار نہ دیکھا نہ سنا

چشم وا رہتی ہیں اور گوش برآوازِ قدم
عاشقوں کو کبھی بیکار نہ دیکھا نہ سنا

یہ غزل جس نے سنی دیکھ کے بولا معروف
کہیں اس میں نہیں بیکار نہ دیکھا نہ سنا

ڈبو دیا مجھے اِس چشم تر کو کیا کوسوں
جلا دیا مجھے سوزِ جگر کو کیا کوسوں

کہے تھا مجھ سے کہ سو کوس روز چلتا ہوں
گیا تو مر ہی گیا نامہ بر کو کیا کوسوں

یونہی بغل سے مری مفت لے گیا دل کو
بغل بھی گرم نہ کی مفت بر کو کیا کوسوں

کل ان سے بزم میں بوسہ طلب کیا تو کہا
حیا کسی کی نہیں اس لبشر کو کیا کوسوں

دیا ہے اپنے سے ظالم کو اس نے دل معروف
اب اور اس بتِ بیدادگر کو کیا کوسوں

اشعار متفرق

بڑا سنتے تھے ہم روزِ قیامت اور روز وں سے
قیامت سے بڑا نکلا جو دیکھا روزِ ہجراں کا

جو بھیجتا وہ مرے خط کا دل فریب جواب
تو کاہے کو مجھے دیتا بھلا طبیب جواب

آپ جس وقت رقیبوں کی قسم کھاتے ہیں
ہم رقیبوں کے نصیبوں کی قسم کھاتے ہیں

یہ اوج خاک نشینی میں عشق نے بخشا
کرے ہے آہ مری آسمان سے باتیں

نہ سوجھے ہے نہ انکار کیا جاتا ہے
رگِ جاں ہے کہ کمر کچھ نہیں معلوم

رو ٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ولے
مڑکے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

کسی کی چشمِ سرمگیں نے بے اجل مارا مجھے
سر پہ میرے جو قضا آئی تو شرمائی ہوئی

بعد مرنے کے ملی مری سیہ بختی کی داد
نعش کے ہمراہ تھا وہ موئے سر کھولے ہوئے

کیا چھٹی اس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے
ہاتھ ملتا ہو گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے

ممنون

نام میر نظام الدین متخلص ممنونؔ۔ لقب فخر الشعراء۔ ولد میر فخر الدین۔ آپ محمد اکبر شاہ بادشاہ دہلی کے استاد تھے۔ آپ سونی پت میں پیدا ہوئے اور دہلی میں تربیت پائی۔ آپ اجمیر شریف میں عہدہ صدر الصدور پر مامور تھے۔ مدتوں لکھنؤ میں بھی رہے۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں دہلی میں انتقال کیا۔

نکہت کو تم سے لے ہے صبا اور صبا سے ہم
لے عطر ترے تن سے قبا اور قبا سے ہم

دنیا ہے ایک گام سرِ راہِ عشق میں
الفت سے سیکھتے ہیں وفا اور وفا سے ہم

پہونچی نہ ایک بار اجابت کے در تلک
لگ آئی ہے اثر سے دعا اور دعا سے ہم

دامان بھر کے لیتے ہیں نکہت سے ہر سحر — گل سے چمن، چمن سے ہوا اور ہوا سے ہم
ہر ایک تازہ رنگ ہے خونِ بدل نہاں — خوں تیرے ہاتھ سے لے حنا اور حنا سے ہم
ہر گرمِ جستجو ہیں ترے بسکہ دشت دشت — منت پذیر ہم سے ہیں پا اور پا سے ہم
آشفتہ سے رکھے ہے یہ روزگار ربط — شانے سے مو و مو سے بلا اور بلا سے ہم
ممنون کا درد دیکھ کے فرمائے ہے مسیح — عاجز ہے اس مرض سے دوا اور دوا سے ہم

لے لیا بوسہ تو اس نے دیں نہ کیا کیا گالیاں — یاں گنہ سے بھی زیادہ ہے مزہ تعذیر کا
گلشنِ اقبال تک مردوں کے کب پہونچی خزاں — سبزۂ پژمردہ کبھی دیکھا نہیں شمشیر کا
شعلہ زن رہتا ہے سوزِ دل سے پہلو میں مرے — جوں زبانِ شمع ہے پیکان اس کے تیر کا
ہر پری رخسار کا رہتا ہے منھ اس کی طرف — سیکھے آئینہ سے کوئی یہ عمل تسخیر کا
فالک پر آ کر مری کہنے لگا وہ پُر غرور — معتقد ہوں جذبۂ الفت کی میں تاثیر کا

جھکی نگاہ میں ہے ڈھب پرسشِ نہانی کا — حیا میں زور دیا رنگ مہربانی کا
جیا میں گرمِ نفسِ سوز سے کہ بہر چراغ — کرے ہے شعلہ بھی کام آبِ زندگانی کا
کہاں سے روز دل و سینہ و جگر لاؤں — تمہیں لگانا ہے یہ ہاتھ تیغ زانی کا
الٰہی حبیب کے دامن سے آستین بھولوں — مژہ نے سیکھ لیا شغل خونفشانی کا
نہیں بچا مرضِ عشق سے کوئی ممنون — ہمیں دریغ بہت ہے تری جوانی کا

تجھے، نقشِ ہستی مٹایا تو دیکھا — جو پردہ تھا حائل اٹھایا تو دیکھا
یہ سب تیرے ہی حسن کا پرتو ہے — نہ دیکھا تجھے تیرا سایا تو دیکھا
برا مانئے مت مرے دیکھنے سے — تمہیں حق نے ایسا بنایا تو دیکھا
نہ ہو کیونکہ ممنون پیرِ مغاں کا — یہ عالم، جو ساغر پلایا تو دیکھا

گماں کیونکر نہ کروں تجھ پہ دل چرانے کا
جھکا کے آنکھ سبب کیا ہے مسکرانے کا

کسی کے ہونٹ کے ملتے ہی بس تمام ہوئے
مزہ ملا نہ ہمیں گالیاں بھی کھانے کا

یہ سینہ ہے یہ جگر ہے یہ دل ہے بسم اللہ
اگر خیال ہے تلوار آزمانے کا

کیا فریفتہ کہہ کہہ کے حالِ دل اس کو
اثر فسوں سے نہیں کچھ کم اس فسانے کا

بندہ ہوں حسنِ صورتِ عشقِ مجاز کا
ہر آئینہ میں جلوہ ہے اس جلوہ ساز کا

شغلِ شبِ فراق یہی تھا کہ دھیان میں
اک اک شکن گنا تری زلفِ دراز کا

اشعار متفرق

کس قدر شرحِ گرانباریٔ غم لکھے تھے
کہ مرے نامے نے بازوئے کبوتر توڑ دیا

کس نے مرے سینہ سے ملے دیدۂ تر رات
پژمردہ جو پھولوں کا سحر ہار نہ پایا

بے چین شبِ وعدہ رکھے ہے خلشِ دل
لے جاتی ہے سو مرتبہ در تک طپشِ دل

بیتابیٔ دل تیرے شہیدوں کی کہاں جائے
کچھ کم رگِ بسمل سے نہیں تارِ کفن کا

دل میں جو جو ہے نکالیں وہ ذرا بول کے خوب
آج اس شوخ سے لڑ لیجئے دل کھول کے خوب

میں نثار اس شوخ کے اپنی بلائیں آپ لیں
آئینہ میں زلف چھوٹی اپنے منہ پر دیکھ کر

مدت سے آب ہو کے بہا چشمِ تر کی راہ
ممنون کیا بیان کروں ماجرائے دل

پوچھیں گے گر آرزو دمِ ذبح
جلاّدہی کو بتائیں گے ہم

منحور

منشی اسد اللہ معروف بہ علی جان متخلص منحور ولد منشی حیدر علی باشندہ چیچڑہ متصل ہگلی (بنگال) شاگرد عبدالغفور نساخ۔ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں

ہیں اپنے ہی زلف و رخ پہ مائل خیال ان کو ہو کیا کسی کا
بس ان روزوں سر چڑھا ہے شانہ نصیب جاگا ہے آرسی کا

زباں پہ تیری ہی گفتگو ہے نظر میں ہر وقت تو ہی تو ہے
نہ حور کی دل میں آرزو ہے نہ شوق رکھتے ہیں ہم پری کا

میں بدگماں چرخِ کینہ پرور وہ بے وفا تندخو ستمگر
نبھے گی متحور ان سے کیونکر وصال میں بھی ہے ڈر اسی کا

طرب کے ساماں بہم ہیں یکسر ہے بزم بزم فلک سے بڑھ کر
دماغ اپنا ہے آسماں پر وہ ماہ پیکر جو ہے بغل میں
ہوئی ہے مہر و وفا سے خلقت سرشت میں اپنی ہے محبّت
بھری ہے سر میں ہوائے الفت آتشِ عشق آب و گل میں

ذکر کرتا ہے اگر میری وفا کا کوئی
شرم سے سر کو جھکا لیتا ہے کیسا کوئی
مجھ سے پڑھوائے وہ خط غیر کا اے وائے نصیب
یہ بھی ہے اپنے مقدّر کا نوشتہ کوئی
بیٹھو بیٹھو اجی نام نہ لو بس جانے کا
آج سنتا ہے کہاں وعدۂ فردا کوئی

فراقِ یارِ جانی میں یہ ضعف و ناتوانی ہے
لبوں پر جان زار آئی تو وہ بھی لاکھ مشکل سے
ہمارے ساتھ جب اس شمع رو کی گرمیاں دیکھیں
رقیب روسیہ جل جل کے نکلے شب کو محفل سے

ضعف سے جوشِ جنوں میں بھی ہیں بیکار قدم
بیٹھ جاتا ہوں جو چلتا ہوں کبھی چار قدم
تابکے جامہ دری دشت نوردی کب تک
تھک گئے ہاتھ بس اب ہو گئے بیکار قدم

آرائشِ جہاں سے رہیں پاک سر بلند
آلودہ ہو نہ گرد سے دامن سحاب کا
کب راستی سے ہووے سبک وضع آشنا
سیدھا نہ ہو سکے کبھی ساغر حباب کا

آٹھوں حاصل ہیں ہوائے برشگالی میں مجھے
باغ، مطرب، شیشہ، ساقی، خم، سبو، ساغر، شراب
جام مے پیتے ہی زاہد کیوں نہ بہکے میکشو
مست کر دیتی ہے کم ظرفوں کو چلّو بھر شراب

کیا لال لال نشے کے ڈورے ہیں ہائے ہائے
آنکھوں میں صاف ڈھنگ ہیں صبح بہار کے

باندھو عبث نہ قتل پہ مخمور کے کمر
کیا ہاتھ آئے گا کہو عاشق کو مار کے

ابھی باندھے گا ہاتھوں ہاتھ وہ شوخ
نہیں یہ شوخیاں اچھی حنا کی

ہوا وہ بت نہ ہرگز رام اپنا
خدا سے میں نے کیا کیا التجا کی

بزم رنداں میں عجب عیش و طرب کا جوش ہے
عرش اعلیٰ تک زمیں سے شور نوشا نوش ہے

فصل گل میں بادۂ گلرنگ سے انکار کیا
زاہدا توبہ سے توبہ کر تجھے کچھ ہوش ہے

اشعار متفرق

غیر ممکن ہے مداوا عشق کے آزار کا
منہ تکے حیرت سے عیسیٰ بھی ترے بیمار کا

ذکر اغیار سن کے مرا دم الجھا
چین سے وصل میں بھی یار نے سونے نہ دیا

قتل ہوکر آج میں چھوٹا عذاب ہجر سے
خون ناحق کا مری گردن پہ احساں ہوگیا

کیا ہوا حضرت مخمور کہو خیر ہے کچھ
نام سنتے ہی جو روتے ہو شکیبائی کا

بزم اغیار میں جاگے ہو مگر شب کو
شمع رو آج نظر آتا ہے چہرہ اترا

بتوں سے کر نہیں سکتا کبھی گلہ دل کا
عجب طرح کا ہے نازک سا معاملہ دل کا

وہ کھلے بالوں مری نعش کے ہمراہ ہوئے
بعد مرنے کے کھلا نالۂ شب گیر کا پیچ

ہزار شوق رہائی نثار پابندی
ہزار حسرت پرواز ہے فدائے قفس

کون کہتا ہے غم عاشق نہیں معشوق کو
مرگ پروانہ پہ سر دھنتی ہے بیتابانہ شمع

خالی نہیں ہے عشق سے دنیا میں کوئی شے
لازم ہے آدمی کو کسی سے لگائے دل

چڑھا خنجر بکف مخمور جب وہ ترک سینہ پر
سراسر کھنچ گئی تصویر اس کی چشم حیراں میں

رندوں کی خوش گزرتی ہے بزم شراب میں
مرتا ہے شیخ خدشۂ روز حساب میں

سنا قیامت کی آواز کہاں آتی ہے
میکشی کے لئے کرتی ہے تقاضا بدلی

یہ صفائی رخ سے حیراں ہے تو وہ زانوں سے ہے
آئینہ بھی بن گیا تصویر پشت آئینہ

یادِ رُخِ پُر نور نے پھونکا مرے دل کو — کعبہ میں بھی لو آگ لگی شمع حرم سے
منتظر بارانِ رحمت کا ہر اک میخوار ہے — مانگ اے زاہد دُعا بہرِ خدا برسات کی

منیر

نام محمد اسمٰعیل حسین تخلص منیر۔ خلف سید احمد حسین شاد۔ آپ ۱۸۱۷ء میں شکوہ آباد میں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں لکھنؤ چلے آئے اور علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ اول ناسخ کے شاگرد ہوئے اور پھر اشک کی شاگردی میں آگئے۔ آپ کانپور چلے آئے اور ایک رئیس کے یہاں ملازم ہوگئے۔ ان سے کسی بات پر رنجیدہ ہوکر پھر لکھنؤ چلے آئے۔ اسی زمانہ میں فرخ آباد کے ایک رئیس کے یہاں پہونچ گئے کچھ دنوں بعد ان رئیس صاحب کا انتقال ہوگیا اور آپ پھر لکھنؤ استاد کی خدمت میں چلے آئے۔ آپ کو ایک مشاعرہ میں کانپور جانے کا اتفاق ہوا۔ مشاعرہ میں رئیس باندہ نواب علی بہادر بھی موجود تھے۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ نواب صاحب کو سرکار برطانیہ کی کسی ناراضگی پر حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور انڈمان بھیجدیئے گئے اور منیر کو بھی ان کی ہمراہی میں یہ سزا بھگتنی پڑی۔ غدر کے بعد خیر خواہانِ برطانیہ کا ایک جلسہ الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور بھی موجود تھے۔ جلسہ میں ایک گویّے نے منیر کی مشہور غزل گائی جس کا مقطع یہ تھا۔

میرے ہُنر کا کوئی نہیں قدرداں منیر — شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

نواب صاحب کو یہ غزل بہت پسند آئی۔ اور انہوں نے بھی اس زمین میں غزل کہی جس کا مقطع یہ ہے۔

ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں — شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

نواب صاحب شاعر بھی تھے اور ناظم تخلص فرماتے تھے۔ نواب صاحب کو گویّے سے غلط معلوم ہوا کہ منیر صاحب لکھنؤ میں ہیں لہذا نواب صاحب نے ایک رقعہ اور زادِ راہ دیکر ایک شخص کو منیر صاحب کو بُلانے کے لئے بھیجدیا۔ مگر وہ وہاں نہیں ملے

بالآخر ۱۸۶۰ء میں جب منیر رہا ہو کر لکھنؤ آئے تو آپ کو حالات کا پتا لگا اور اپنی بدقسمتی پر بہت افسوس کیا۔ اس زمانہ میں جشن ولادت ولی عہد رام پور کی خبر آپ کو ملی۔ آپ نے ایک تہنیت نامہ مع قطعات تاریخ و عرضی نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کر دی جس پر قدرداں نواب نے آپ کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔ اور اپنا مصاحب خاص بنا کر سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ آپ آخری وقت تک نواب رام پور کے یہاں ہی رہے اور ۱۸۸۴ء میں وہیں وفات کی۔

ثابت رہا فلک مرے نالوں کے سامنے — ٹھہرا سپر حباب کی بھالوں کے سامنے
آنکھوں میں پھرتے ہیں نہیں آتے ہیں روبرو — پردے پڑے ہیں دیکھنے والوں کے سامنے
فیاض سائلوں سے نہیں کرتے سرکشی — شیشوں کے سر جھکے ہیں پیالوں کے سامنے
میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیرؔ — شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

ہر گھڑی رہتا ہے مجکو ڈر تری تلوار کا — روز ہوتا ہے تصدق جس پہ سر دو چار کا
ہاتھ بھی اس کو لگاتا ہے کوئی اب یا نصیب — دن بدن بد تر ہے احوال اس ترے بیمار کا
موتیوں کا ہار تو پہنا کرے ہے تو سدا — دیکھ یاں آ کر تماشا آنسوؤں کے تار کا
دیکھ کر صورت مری حسرت زدہ اے دوستو — اک تحیر کا سا عالم ہے در و دیوار کا
اشک کے بدلے لہو آنکھوں سے آتا ہے مرے — روتے روتے حال یہ ہے دیدۂ خونبار کا

ساون میں بھی وعدہ کبھی پورا نہیں کرتے — باتوں میں جھلاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے
کب دل مرا تقریر سے کھٹا نہیں کرتے — تم اپنی ترش روئی سے چوکا نہیں کرتے
گرمی میں جلانے کے لئے دیتے ہیں پیپے چھینٹے — خس خانہ میں بھی دل مرا ٹھنڈا نہیں کرتے
بھاری ہے بہت اس کی نزاکت کو نہایت — کب بوجھ سے کرتی کے وہ لچکا نہیں کرتے

شکوہ

دل تو پژمردہ ہے داغِ غم گلستاں ہوں تو کیا — آنکھیں روتی ہیں دہانِ زخم خنداں ہوں تو کیا

داغِ غم دل پر اٹھا کر مرنے والے مر گئے — آج قبروں پر اگر سروِ چراغاں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت — اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومع ویران ہیں — یادِ حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا

خانقاہیں منہدم ہیں میکدے آباد ہیں — رنج میں ہیں اہلِ دیں خوش اہلِ عصیاں ہوں تو کیا

صوفیانِ صاف طینت واصلِ حق ہو گئے — خود نما دو چار ننگِ اہلِ عرفاں ہوں تو کیا

کاملوں کو کر دیا برباد تو نے اے فلک — چند نالائق ترے ممنونِ احساں ہوں تو کیا

جاں بلب ہیں غم سے استادانِ فنِ نظم و نثر — مطمئن اس عہد میں دس بیس ناداں ہوں تو کیا

دیں فروشی کرتے ہیں اونچے خریداروں کے ہاتھ — کامیابِ مال ہیں محرومِ ایماں ہوں تو کیا

حافظ و قاریٔ کامل پڑھ رہے ہیں صمٌّ بکمٌ — لاف زنِ آفاق میں لاکھوں غلط خواں ہوں تو کیا

نوحہ گر ہیں قاضیان و مفتیانِ اہلِ عدل — چند نامنصف پناہِ اہلِ دوراں ہوں تو کیا

علمِ دیں کوئی پڑھائے یا پڑھے کس کی مجال — حرفِ علمِ دنیوی طفلِ دبستاں ہوں تو کیا

بجھ گئیں شمعیں جلے پروانے تو کیا فائدہ — اڑ گئے پروانے شمعیں نور افشاں ہوں تو کیا

دیکھنے والے نہیں پھر آئینے کس کام کے — بے زلیخا شہر سارے یوسفستاں ہوں تو کیا

چھپ گئے گوشوں میں عنقا کی طرح نباضِ عقل — آج بیمار و مسیحا دونوں یکساں ہوں تو کیا

روئیے کس کس مزے کو یاد کر کے اے فلک — زخمِ دل پر سینکڑوں خالی نمکداں ہوں تو کیا

کربلا میں یا نجف میں جا کے مر جائیں منیرؔ — ہند میں ہم پہلوئے گورِ غریباں ہوں تو کیا

مومن

نام حکیم مومن خاں تخلص مومنؔ شاگرد شاہ نصیر خلف حکیم غلام نبی۔ آپ ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ جب کسی قابل ہوئے تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور ان ہی کی نگرانی میں نسخہ نویسی کا تجربہ حاصل کیا

آپ طب کے ساتھ ساتھ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر جاں بحق ہوئے۔

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا ہیں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

چلی ہے جان، نہیں تو نکالو کوئی راہ
تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی

جو بے حجاب نہ ہوگی تو جان جائے گی
کہ راہ دیکھی ہے اس نے حیا کے آنے کی

پھر اب کے لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی

خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے
اجل بھی رہ گئی ظالم سنا کے آنے کی

مرے جنازہ پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ
کہ دیر اٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنے کی

مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر
کیونکر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل سے نکال دیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

گئے وہ خواب سے اٹھ غیر کے گھر آخرِ شب
اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخرِ شب

صبح دم وصل کا وعدہ تھا یہ حسرت دیکھو
مر گئے ہم دمِ آغازِ سحر آخرِ شب

شعلہ آہ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ — اوّلِ ماہ میں چاند آئے نظر آخرِ شب
ملے ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد — جلوہ خورشید کا سا تھا کچھ اُدھر آخرِ شب
غیر نکلا ترے گھر سے گئی اس وہم میں جاں — غل ہوئے چور کے اس کوچہ میں مگر آخرِ شب
دی تسلّی تو وہ ایسی کہ تسلّی نہ ہوئی — خواب میں تو مرے آئے مگر آخرِ شب
مُو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومنؔ — نیند آتی ہے بہ آرامِ دگر آخرِ شب

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلسِ ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے
تابِ نظّارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے
ہم نکالیں گے سن اے موجِ صبا بل تیرا — اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
منّتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے
چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں — ایک میں کیا سبھی چاکِ گریباں ہونگے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے
عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

صبر وحشت طلب نہ ہو جائے — کہیں صحرا ابھی گھر نہ ہو جائے
ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں — زندگی پردہ در نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم — کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے
اے قیامت نہ آئیو جب تک — وہ مری گور پر نہ ہو جائے
مرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ — تجکو اپنی نظر نہ ہو جائے

دربدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے
رہیں حشر تلک بہرِ دعا گو لبِ زخم — پر ترا حق نمک کوئی ادا ہوتا ہے
واقعی سجدۂ در ایسی ہی تقصیر ہے اب — جور جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے

چاک پیراہنِ گل پر تو نہ پھول اے بلبل　　جامہ یارانِ لباسی کا قبا ہوتا ہے

ان سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہوگا　　میں تو ہیں غیر بھی دل دیکھ پشیماں ہوگا
کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل　　تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری　　چارہ گر ہم نہیں ہونگے جو درماں ہوگا
بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا　　دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیماں ہوگا

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم کو بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ کہتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مہر

نواب امین الدولہ سید آغا علی خاں۔ متخلص مہرؔ۔ خلف معتمد الدولہ مولد لکھنؤ مسکن کانپور۔ شاگرد حضرت ناسخؔ و اشکؔ۔ مدفن نجف اشرف۔ آپ نے کربلا کی بھی زیارت کی تھی صاحبِ دیوان ہوتے ہیں۔

ہجر میں ہوں جفا طلب رنج طلب بلا طلب　　نوحہ طلب فغاں طلب داغ طلب بکا طلب
جتنے ہیں تخت و فوق میں پھرتے ہیں تیرے ذوق میں　　رہتے ہیں تیرے شوق میں درد طلب دوا طلب

دیکھ لطفِ عتاب یار اے دل — دل میں غصّہ ہے پیار آنکھوں میں
ہم وہ باہم ہیں محوِ محبتِ عشق — ایک جلوہ ہے چار آنکھوں میں

اشعار متفرق

بڑے قصّوں سے یہ ہاتھ آیا ہے — دیکھتا ہے اک کہانی چھلاّ
فانوس ہیں اس شمعِ صباحت کے سب افلاک — جو کوکب سیارہ ہے پروانہ ہے اس کا
اس کو لذّتِ عشق کی اصلا نہیں — جو ترے خنجر تلے تڑپا نہیں
تلخ باتیں ہیں میٹھی نظریں ہیں — زہر منھ میں نبات آنکھیں ہیں
حسن وہ شے ہے کہ بے جانوں میں بھی تاثیر ہے — دیکھتا رہتا ہے تجکو انجمن میں آئینہ
بت کہا تجکو یا خدا سمجھے — سمجھے جو کچھ تجھے بجا سمجھے
ہے نام خدا سحرِ مجسّم صنم اپنا — افسوں کی جو باتیں ہیں تو جادو کے اشارے
رکھتے ہیں خارِ دشت نوکِ زباں — شرح میری برہنہ پائی کی
بال چوٹی کے کریں گے بدنام — یہ ترے پیچھے پڑے رہتے ہیں

میر

نام میر تقی میر تخلص میر۔ آپ کے والد میر علی متقی شرفائے اکبر آباد سے تھے
میر صاحب سراج علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے۔ آپ جوانی ہی میں دہلی آگئے تھے
اور آرزو صاحب کے ہی دامن میں تربیت اور پرورش پائی۔ آپ کا سن پیدائش
۱۷۱۰ء ہے۔ اردو زبان کا ذوق رکھنے والا طبقہ آپ کو شاعری کا پیشرو مانتا ہے
مرہٹوں کے حملوں سے سلطنت کی تباہی کے بعد آپ بھی تباہی کا شکار ہوگئے مگر اس
پر بھی آپ دہلی میں قدم جمائے بیٹھے رہے مگر جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو ساٹھ سال
کی عمر میں دہلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہونچ گئے۔ ایک مشاعرہ میں اہلِ شہر سے تعارف ہوا
رفتہ رفتہ آپ کی رسائی نواب آصف الدولہ تک ہوگئی۔ نواب صاحب نے آپکے لئے
تین سو روپیہ ماہانہ بطور وظیفہ مقرر کر دئے جو آپ کو تاحیات ملتے رہے۔ قریب سو سال
کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں رحلت کی۔ آپ کی تصنیفات میں چھ دیوان ریختہ ایک دیوان فارسی

اور تذکرہ شعرا یادگار ہیں۔

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں ترے کیا نہیں ہیں
جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات اک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا ق

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بارہا اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا تو کہا 'یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے'

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر   سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی
اس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو   کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا   گھر جلا سامنے اور ہم سے بجھایا نہ گیا
گرمِ رو راہِ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ   اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
دل میں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک   ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا   سر بھی تسلیم محبت میں جھکایا نہ گیا

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا   حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
فیض اے ابر چشمِ تر سے اٹھا   آج دامن وسیع ہے اس کا
تاب کس کو جو حالِ میرؔ سنے   حال ہی کچھ اور ہے مجلس کا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور تھا　　یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں　　تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز　　میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

رہی ناگفتہ مرے دل میں داستاں میری　　نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا　　خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
اسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا　　گئی یہ عمر عزیز آہ رائیگاں میری
دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میرؔ　　پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری

بزم میں جو تیرا ظہور نہیں　　شمع روشن کے منھ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک　　یاد رہتی ترے حضور نہیں
فکر مت کر ہمارے جینے کا　　تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں

ناجی

نام محمد شاکر تخلص ناجی۔ آپ محمد شاہ بادشاہ کے وزیر امیر خاں کے نعمت خانے کے داروغہ تھے ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت اس قلم کے سپاہی کو بھی میدانِ جنگ میں تلوار اٹھانی پڑی ۱۷۵۰ء میں آپ نے انتقال کیا۔

زلف کے حلقے میں دیکھا جب سے دانہ خال کا　　مرغِ دل عاشق کا تب سے صید ہے اس جال کا
گندمی چہرے کو اپنے زلف میں پنہاں نہ کر　　ہندواں سنکر مبادا شور ڈالیں کال کا
بے نواؤں سے نہ مل اے موکمر پیچ کھا　　مونڈ سر لڑکوں کو کہتے ہیں وہ اپنا بال کا
تھک رہا ہے چرخ بے مروت سے امید　　پیر زالوں سے نہیں احسان کر اک بال کا

اپنے ناجی کے تئیں آکر جِلا لے پیار سے | جاں بلب ہوں اے سجن اب دم نہیں اِجمال کا

نہ تھا آزردہ دل کنعاں سے یوسف | ذرا تھا خواب میں اخواں سے یوسف

نہ ہوتا راہ میں گلبانگِ شہرت | جو روتا راہ میں خاراں سے یوسف

کنویں میں جا پڑا یعقوب کا دل | چلا جب نالہ و افغاں سے یوسف

زلیخا نے بہائے شیر کے نیل | جو رویا درد کے اچھواں سے یوسف

جو ناجی ڈر نہ ہوتا معصیت کا | نہ گردن پھیرتا فرماں سے یوسف

شیشہ اسی کے آگے بجا ہے کہ رخ سیتی | پیالے کو جب لے ہاتھ میں زرشکِ پری کرے

اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو ہے آجا | شمشاد دو سروں کے آگے تری چاکری کرے

دشمن ہے دین کا خالِ سیہ مکھ ادھر ترے | ہندو ہے کیا عجب ہے اگر چاکری کرے

ناجی جو کوئی صاف کرے دل کا آئینہ | وہ عاشقی کے ملک میں اسکندری کرے

دیکھ کر موہن تری کمر کی طرف | پھر گیا پانی اپنے گھر کی طرف

جن نے دیکھے ترے لبِ شیریں | نظر ان کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال ان کا دام میں آنا | دل ہے ان بتاں کا زر کی طرف

حشر میں پاکباز ہے ناجی | بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

اے صبا کہہ بہار کی باتیں | اس بتِ گلعذار کی باتیں

کس پہ چھوڑے نگاہ کا شہباز | کیا کرے ہے شکار کی باتیں

چھوڑے کب ہیں نقدِ دل کو صنم | جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں

اشعار متفرق

کفن ہے سُرخ ترے گیسوؤں کے ماروں کا | مکانِ غم ہے ترے در کے بے قراروں کا

دکھے اس لالچی لڑکے کو کب تلک بھلا — چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

گر ہو وہ بُتِ ہندو کبھی اشنان کو ننگا — بھنور میں دیکھ کر جمنا سے غوطہ میں جا لگتا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشمِ امید — لبِ صدف کے تر نہیں ہر چند گوہر میں ہے آب

روئے روشن کی جو کوئی یاد میں مشغول ہے — تہر اس کے روبرو سورج مکھی کا پھول ہے

جہاں دل بند ہو ناصح وہاں آدے خلل کرے — رقیبِ نا ولد ناجی گویا لڑکوں کا بابا ہے

تری نگاہ کی حسرت سے اے کمانِ ابرو — ہمارے سینہ میں تو دہ ہوا ہے تیروں کا

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لیجاتا ہے وہ — پاس مرے بت تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

تصور میں ترے رُخ کے گئی ہے نیند آنکھوں سے — مقابل جس کے ہو خورشید اس کو خواب کب آئے

غرض غصہ میں کبھی اہلِ وفا کی نہ سُنے — ہٹ پہ آجائے وہ کافر تو خدا کی نہ سُنے

محبت سے علی کی دیکھ ناجی — ہوا ہے دل مرا حیدر آباد

ماہ رو جب سفید پوش ہوا — ہر طرف چاندنی کا جوش ہوا

ترے رخسار کے پرتو سے اے شوخ — پری خانہ ہوا گھر آرسی کا

نادر

نام مرزا کلب حسین خاں ڈپٹی کلکٹر اٹاوہ متخلص نادر خلف کلب علی خاں، شاگرد ناسخ - آپ بڑے کثیر گو شاعر تھے - آپ کا ایک مجموعہ نظر سے گذرا ہے۔ جس میں آپ نے قریب پانچسو استاد شاعروں کی غزلوں کو تضمین کیا ہوا ہے یہ مجموعہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ آپ کا کلام کمیاب ہے۔

دل میں ہوسِ زلفِ چلیپا نہیں رکھتے — ہم سر نہیں رکھتے کوئی سودا نہیں رکھتے

ہم خاک نشینوں سے کدورت نہیں لازم — کیوں آئینۂ دل کو مصفا نہیں رکھتے

کہتا ہے کفِ دستِ مصفا کو دکھا کر — موسیٰ کی طرح ہم یدِ بیضا نہیں رکھتے

تضمین بر غزل صفیر بلگرامی از نادر

مطلق نہ کارگر ہوئی تاثیر آہ کی — الٹی سزا ملی مجھے الفت کی چاہ کی

حالت ہے اب یہ عشق میں مجھ بے گناہ کی — دل سے گزرتی ہے نظر اس رشکِ ماہ کی

بوتل تراشی ہے سروہی لنگاہ کی

کچھ کارِ خیر یہ جو ہو اِتر ہے سے نظر   فرصت نماز پڑھنے سے ہووے تجھے اگر
تو آکے اوجِ بام پر اپنے دمِ سحر   ساقی دعائیں مانگ تو زلفوں کو کھول کر
رندوں کو احتیاج ہے ابرِ سیاہ کی

سیلِ سرشک کا نہیں مخفی ہے ماجرا   نالوں میں جو اثر ہے ہر اک پر ہے وہ کھلا
ضبط آپ سے بھی دیکھئے ہرگز نہ ہو سکا   آخر حضور کو بھی جگر تھامنا پڑا
کیوں آپ نے بھی دیکھ لی تاثیر آہ کی

راحم گناہگاروں پہ اللہ ہے بڑا   اس کے کرم کی حد ہے نہ رحمت کی انتہا
اعمال گر بُرے ہیں تو پھر دغدغہ ہے کیا   دریائے رحم جوش میں آیا تو دیکھنا
کاغذ کی ناویں بن گئیں فردیں گناہ کی

واقف ہوا کبھی نہ ہمارے تپاک سے   کھینچی ہمیشہ آہ دلِ دردناک سے
زائل غبار اب تو کرو طبعِ پاک سے   دامن اٹھائے چلتے ہو عاشق کی خاک سے
پھر پھر کے سنتے جاؤ صدا آہ آہ کی

ثابت ہے یہ کہ دل سے وفا کو اٹھا دیا   جو رنج عمر بھر نہ ہوا تھا دکھا دیا
بدنام عاشقی کو کیا دل دُکھا دیا   کھینچا جو جذب سے تو کنوئیں میں گرا دیا
یوسف کی واہ خوب زلیخا نے چاہ کی

کیا کیا کہوں الم سے جو کچھ سامنا ہوا   کیا کیا مصیبتوں میں ہوا وہ بھی مبتلا
نادرؔ کی طرح رنج و الم درد میں پڑا   صدمہ ہوا صفیرؔ کا دل ہاتھ سے گیا
کیسی بُری طرح اجی تم نے لنگاہ کی

اشعار متفرق

چوٹی کی فتح پیچ پیچ سے ہوئی شکست   آخر اسیرِ طرّۂ طرّار ہو گیا
ڈرتا نہیں ہوں گیسوؤں کے عشق سے ذرا   دل کا حساب حشر میں بال بال کا
واں نزاکت سے ہے ٹوپی تنگ گراں بالائے سر   کوہِ غم رکھتے ہیں یاں ہم ناتواں بالائے سر

کیا زبردست آب و دانہ ہے گہر کا دیکھنا
نکلا دریا سے تو کیسا جلد پہونچا کان تک

کون کہتا ہے کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

سُرخ ڈورے میں گندھا موتی نظر آنے لگا
میں نے انگشتِ حنائی کو جو دایا دانت میں

نہیں ہے خال لبِ تر کے پاس جلوہ نما
یہ شیر ہے کہ جو بیٹھا ہوا کچھار میں ہے

ناسخ

نام شیخ امام بخش متخلص ناسخ۔ متبنّیٰ خدا بخش خیمہ دوز ولادت ۱۱۹۰ھ۔
آپ کا بچپن فیض آباد میں گزرا۔ آپ کی طبیعت ورزش کی طرف مائل ہو گئی تھی جس کے سبب بدن کسرتی اور پھُرتیلا ہو گیا۔ فیض آباد کے ہی نواب محمد تقی نے آپ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ ایک مرتبہ نواب صاحب آپ کو ساتھ لیکر لکھنؤ آئے یہاں میر کاظم علی ایک رئیس تھے انہوں نے آپ کو اپنا فرزند بنا لیا۔ میر کاظم علی کے مرنے کے بعد ان کی تمام دولت آپ کے ہاتھ آ گئی اور آسودہ حال زندگی بسر کرنے لگے اور ایک مکان لیکر وہیں بود و باش اختیار کر لی۔
اتفاق سے آپ کے مکان کے سامنے ایک مولوی وارث علی رہتے تھے اور وہ طلبا کو اپنے کمرے میں مفت تعلیم دیتے تھے۔ لہذا آپ کو علم سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور ان ہی کے زیر سایہ تحصیل علم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طبیعت کے تیز تھے تھوڑے ہی دنوں میں علم کی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ شاعری کا شوق ابتدا سے ہی تھا۔ مگر کبھی کسی استاد سے منسلک نہیں ہوئے۔ آخر فنِ شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ آپ کے شاگرد بھی اُستادی کے رتبہ کو پہونچے اور نام پیدا کیا۔ ۱۲۵۴ھ میں آپ نے انتقال کیا۔

واعظا مسجد سے اب جاتے ہیں میخانے کو ہم
پھینک کر ظرفِ وضو لیتے ہیں پیمانے کو ہم

کیا مگس بیٹھے بھلا اس شعلہ رو کے جسم پر
اپنے داغوں سے جلا دیتے ہیں پروانے کو ہم

تیرے آگے کہتے ہیں گل کھول کر بازوئے برگ
گلشنِ عالم سے ہیں تیار اڑ جانے کو ہم

کون کرتا ہے بتوں کے آگے سجدہ زاہدا
سر کو دے دے مار کر توڑینگے بتخانے کو ہم

جب غزالوں کے نظر آ جاتے ہیں چشمِ سیاہ
دشت میں کرتے ہیں یاد اپنے سیہ خانے کو ہم

باندھتے ہیں اپنے دل میں زلفِ جاناں کا خیال
اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو ہم

پنجۂ وحشت سے ہوتا ہے گریباں تار تار
دیکھتے ہیں کاکُلِ جاناں میں جب شانے کو ہم
عقل کھودی تھی جو اے ناسخ جنونِ عشق نے
آشنا سمجھا کئے اک عمر بیگانے کو ہم

مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا
شگفتہ مثلِ گل ہر فصلِ گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا
وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا
دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا
جنوں میں ہجر کی شب ہاتھ دوڑایا ہے جب اپنا
کیا ہے چاک تا جیبِ سحر اپنے گریباں کا
تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

یہ رو ہے روئے مہ جبیں کا کہ خجل ہے چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا
زبسکہ وصفِ دہانِ شیریں رہا ہے وردِ زبانِ شیریں
بدن میں جب تک ہے جانِ شیریں مزہ دہن میں ہے انگبیں کا
یہ سا عدوں کا ہے اس کی عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیامِ تیغِ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا
برا ہو بدبختِ عاشقی کا نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشقِ بتاں میں ٹیکا نشانِ سجدہ مری جبیں کا
طمع ہے انصافِ دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں وہ زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

نکہتِ گل کہتی جاتی ہے زبانِ موج سے
قابلِ نظارہ رنگِ گلشنِ عالم نہیں

ہے فروتن اس لئے زاہد کہ ہو دیں نگوں
قامتِ محراب کچھ بہرِ تواضع خم نہیں
دوست دنیا میں نہیں کوئی کسی کا بے غرض
ہو گئی جب صبح شمعِ مردہ کا پھر غم نہیں
آنکھ نرگس کی نہیں ہرگز جھپکتی اس لئے
ایک لمحہ میں بہارِ گلشنِ عالم نہیں

ہوتی ہے غربت میں ثروت پر بڑی ایذا کے بعد
رنج اٹھائے کسقدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر
اعتماد اصلا نہیں گر ہے جہاں زیرِ نگیں
اٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر
آج تو پوشاک پر مرتا ہے تو کل دیکھنا
جائے گا نباش تیری لاش عریاں چھوڑ کر

رتبہ میری خانہ ویرانی کا ہے ایسا بلند
آسماں کہتے ہیں جس کو میرے گھر کا بام ہے
ہو گئی صبحِ شبِ وصل اس کے جاتے ہی سیاہ
آفتاب اپنی نظر میں اک چراغِ شام ہے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ان ببولوں کی
عجب عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
امیدِ وصل میں ہم جھومتے ہیں برسوں سے
وہاں رقیبوں میں تیاریاں ہیں جھولوں کی

ہم بوسہ مانگتے ہیں وہ کچھ بولتے نہیں
محروم ہے سوال ہمارا جواب سے
جینا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی کہ مر چکے ہیں ہم حساب سے

اشعار متفرق

پوچھا جو مدو کے یار نے ناسخ کے حال کو
ہنس کر کہا رقیبِ شقی نے گزر گئے
دیتا ہے کہاں ساتھ برے وقت میں کوئی
پتھر کو لگی چوٹ شرارے نکل آئے
غم دیا رنج دیا درد دیا داغ دیا
ہو سکیں تجھ سے عوض کیا ترے احساں کے
کسی نعمت سے میں واقف نہیں جز بادۂ تلخ
زاہد اب تو سمجھ تارکِ لذت نہ مجھے
سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ سایہ بھی جدا رہتا ہے تاریکی میں انساں سے
اس قدر کھایا تری فرقت میں غم
دل ہمارا زندگی سے سیر ہے

کوئے جاناں گر نہیں تو کنجِ زنداں ہی سہی
کوئی اے جوشِ جنوں پیدا ٹھکانہ کیجئے

ساقیا دے مجھے شتاب شراب
کب سے کرتا ہوں میں شراب شراب

مرگ اک سوتی تھی ورنہ یہ کراہا شب کو
کہ جہاں کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

جلا کرتا ہوں میں دن رات لیکن مر نہیں سکتا
اثر سوزِ غمِ فرقت میں ہے نارِ جہنم کا

معشوقوں سے امیدِ وفا رکھتے ہو ناسخ
ناداں کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ

نثار

نام محمد امان جان متخلص نثار ولد سعادت اللہ معمار۔ باشندہ دہلی شاگرد شاہ حاتم۔ آپ صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔ آپ کے چند متفرق اشعار حاصل ہوئے ہیں جو پیشِ خدمت ہیں۔

مثالِ برق شیوہ ہے ہمارے آفتِ جاں کا
کہیں دمکا کہیں چمکا کہیں تاکا کہیں جھانکا

ہزاروں جیبِ گل کیوں کر نہ پرزے اس ادا پر ہوں
قیامت جھوم جاتا ہے ہر اک ٹھوکر میں داماں کا

اس کے پاؤں سے لگی رہتی ہے دن رات حنا
خوب دنیا میں بسر کرتی ہے اوقات حنا

پوچھا جو اس نے خوش ہو کہا میں نے شکریہ
بولا کہ ہے یہ شکر شکایت بھرا ہوا

گزرا مرے مزار سے دامن سنبھالتا
کیا خاک پھر غبار میں دل سے نکالتا

شب کو وہ کوٹھے ہی کوٹھے گھر ہمارے آرہا
غیر دروازہ پہ بیٹھا راہ ہی تکتا رہا

ہم سے لڑنے دو انھیں کوئی نہ بولو درمیاں
ایسے ایسے آگے جھگڑے ہو چکے ہیں بارہا

سو بات پوچھئے تو نہ دے ایک کا جواب
کر دے تھکا تھکا کے ہمیں یونہی لاجواب

جہاں ذکر اس کا آتا ہے مرا جی ٹوٹ جاتا ہے
کروں کیا اختیار اپنا نہیں بے اختیاری پر

ہم سے ہو زر وسیم کی تدبیر سو کیا خاک
دنیا میں بڑی چیز ہے اکسیر سو کیا خاک

برنگِ لب ہے طرفہ آشنائی آہ ہم تم میں
کہ ہو جاتی ہے باتوں باتوں میں جدائی آہ ہم تم میں

میں جو کہا لے گئی زلف تری دل مرا
ہنس کے کہا سب غلط اس کی بلا لے گئی

خوبی میں ترے حسن کی کچھ حرف تو کب ہے
لیکن ذرا یہ خط ہے سو اصلاح طلب ہے

اس آئینہ طلعت کی اب مجھ سے یہ صورت ہے
ظاہر میں صفائی ہے باطن میں کدورت ہے

گردش کا اس نگاہ کی اب طور اور ہے
اے ساکنانِ میکدہ اب دور اور ہے

نسّاخ

نام عبدالغفور متخلص نسّاخ۔ شاگرد مولوی حافظ رشید النبی وحشت
آپ پٹنہ کے ڈپٹی کلکٹر اور استاد شاعر تھے۔ آپ بہت سی ادبی کتابوں کے مصنف
ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک تذکرہ بعنوان "سخن شعرا" نظر سے گزرا ہے جو ۱۲۸۵ھ
میں شائع ہوا ہے۔ اس تذکرہ میں لاتعداد شاعروں کا ذکر ہے آپ صاحبِ دواوین
بھی ہوئے ہیں۔

تواضع سے کیا ہے صیدِ ان شہری غزالوں کو
قدِ خم گشتہ کارِ تیر کرتا ہے کماں ہو کر

بلائے تو اشارے سے جو اے پردہ نشیں مجھکو
کریگی کام تیری انگلیاں گویا زباں ہو کر

ہوا گرمِ سخن بے خوف اس سے بزمِ اعدا میں
رہا محفوظ میں بتیس دانتوں میں زباں ہو کر

نہ جائے گا مرا خوں رائیگاں اے قاتلِ عالم
گواہی حشر میں دیگا ترا خنجر زباں ہو کر

مجھے گمراہیِ نسّاخ سے حیرت یہ حیرت ہے
چلا کعبے مریدِ حضرتِ پیرِ مغاں ہو کر

کثرتِ عشّاق نے پردہ میں بٹھلایا تجھے
یہ نگاہوں کا ہجوم اے جان چلمن ہو گیا

ما نکلتا ہے زخمِ دل اس کا ادا سے دیکھنا
رشتۂ نظارہ گویا تارِ سوزن ہو گیا

قتل ہونے پر بھی ہرگز میں نہ نکلا قید سے
زخمِ شمشیرِ ہلالی طوقِ گردن ہو گیا

رشک سے کیونکر نہ مر جاؤں کہ کھایا اس نے سوگ
میری جاں کو موت رنجِ مرگِ دشمن ہو گیا

یاد میں زلفوں کی روشن داغ کیسا ہو گیا
آفتابِ آسمانِ جوشِ سودا ہو گیا

بیٹھے تم پردہ میں بے پردہ ہوا یاں رازِ عشق
پردۂ افشا میں پنہاں روئے اخفا ہو گیا

ہنستے ہنستے باغ میں جو گل کے منھ پر منھ رکھا
سرخ اس گلرو کا منھ غصہ سے کیسا ہو گیا

لاش پر بے پردہ آئے اور سب دیکھیں اسے
ہائے جینے سے بھی بدتر اپنا مرنا ہو گیا

گالی مجھے جو دے تو جلے غیر رشک سے　　اس بت کی دشمنی بھی محبت سے کم نہیں
اس بت کے ہجر میں جو ٹپکتے ہیں اشک صاف　　سنگ چخماق سے کم مری چشمان نم نہیں
دلبر چھپا کسی کا کوئی چال پر لپا　　تعویذ حب بغض ہے نقش قدم نہیں
بھرتے جواب صاف سے ہیں کاسہ سوال　　اس عہد کے بخیل بھی حاتم سے کم نہیں

دم تزئیں جو چھوا شانے کو　　زلفیں الجھیں مرے پھسلانے کو
آہ سوزاں سے دل ہوا ٹھنڈا　　ہے دم سرد جی جلانے کو
جل جل اٹھی اور آگ دل میں مرے　　اشک دوڑے تھے جو بجھانے کو
ہوں وہ افتادہ نقش پا کی طرح　　ننگ سمجھا ہوں سر اٹھانے کو

نہیں ہے اب کوئی ہوس دل اسی سے پہلے　　نکل نہ جائے خدایا کہیں یہ حسرت دل
ہے بوسہ لب شیریں بھی کس قدر شیریں　　کہ بند ہو گئے اے جان لب شکایت دل
طریق عشق میں ہیں خضر راہ اے ناسخ　　ہمارے قبلہ و کعبہ جناب حضرت دل

منھ پر آئینہ نے قلعی بھی چڑھائی لیکن　　نہ ہوا یار ترے منھ کے برابر نہ ہوا
کٹ گیا سر تو مرے منھ سے نکلی یہ صدا　　سر بھی اک بار گراں تھا نہ ہوا سر نہ ہوا
دیکھتا ہوں نظر یاس سے تو کہتے ہیں　　کیا کریں یاس ہمارے کوئی خنجر نہ ہوا

کیفیت سے چشم مست یار میں ڈورے جو ہیں　　مجکو دھوکہ دے رہے ہیں دام آہو گیر کا
جنبش ابرو سے اس کے لوٹتا ہے مرغ دل　　کام وہ صیاد لیتا ہے کماں سے تیر کا
موم دل جو ہے ستاتا ہے اسے ہر سنگ دل　　شمع کا سر کاٹنا اک کھیل ہے گلگیر کا

ہووے گا پردہ فاش دل چاک چاک کا　　چلمن سے شکل اپنی نہ مجکو دکھائیں آپ

روتا ہوں کس کے غم میں ہیں کیا بدگمانیاں — ناحق کا ہائے ہائے نہ طوفاں اٹھائیں آپ

زلفیں سنبل نے سنواریں مسی سوسن نے ملی — آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے

جمع جو عشاق ہیں اور پڑھتے ہیں ہر دم درود — نقش پائے یار کیا تعبیر دلِ مرحوم ہے

گل سے بلبل کو محبت سرو کو قمری سے عشق — فصلِ گل میں رسمِ یاری کی چمن میں دھوم ہے

روز و شب کے حال کے پرچے لگا دیتے ہیں روز — یار کی ڈیوڑھی کے ہرکارے ہیں یہ شمس و قمر

شک نہیں پھرتے ہیں روز و شب تلاشِ یار میں — جب یہ ثابت ہے کہ سیارے ہیں یہ شمس و قمر

دادِ عاشق پر نہ ہو صدمہ کبھی معشوق کو — مرگِ پروانہ کی کرتا نہیں شیون چراغ

جو ہیں عالی منزلت ہے خود بخود ان کو فروغ — مہر و مہ کا چرخ پر جلتا ہے بے روغن چراغ

نسیم

نام اصغر علی خاں متخلص نسیم باشندہ دہلی۔ شاگرد مومن خاں مومن۔ بن آغا علی خاں۔ مقیم لکھنؤ۔ آپ نے ۱۲۸۲ھ میں انتقال کیا۔

اثر پیدا کیا ہے پیرہن نے جسمِ بیماں کا — نہیں دیتا الہٰو تک زخمِ نو چاکِ گریباں کا

لکھا ہے یک قلم مضمون صنعتہائے یزداں کا — جوابِ دفترِ کن ہر ورق ہے اپنے دیواں کا

عیاں ہے مرکے بھی ارمان شہادت ہائے پنہاں کا — کہ عالم سبزۂ تربت پہ ہے شمشیرِ عریاں کا

جہنم کیوں دیکھ کر جلتا ہے دل گبر و مسلماں کا — نہ گل داماں دوزخ کا نہ بلبل باغِ رضواں کا

تماشا جامہ زیبی دیکھئے گی خونِ شہیداں کا — گریباں پیرہن میں ہے ہلالِ عیدِ قرباں کا

جنوں میں بھی تنزل آ گیا کیسی ہو جسمِ عریاں کا — کبھی ہے صدمہ دامن کا کبھی ماتم گریباں کا

تہِ خنجر یہاں تک پاس تھا قاتل کے داماں کا — برنگِ شمعِ کشتہ جل گیا خوں زخمِ خنداں کا

گراں ہوا ہے جنوں کیا دل پہ صدمہ سنگِ طفلاں کا — کہیں ہوں پرورش پایا ہوا سختیِ دوراں کا

گر ہم نے دل صنم کو دیا تو پھر کسی کو کیا
اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

ہم نے تو آپ اپنا گریباں کیا ہے چاک
آپ ہی سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

اپنی تو زندگی یہاں مثل حباب ہے
گو خضر لاکھ برس جیا پھر کسی کو کیا

دنیا میں ہم نے آکے بھلا یا برا نسیم
جو کچھ کیا سو ہم نے کیا پھر کسی کو کیا

اشعار متفرق

ہوں عاشق دیوانہ جو معشوق خدا کا
غل نالۂ زنجیر میں ہے صلِّ علیٰ کا

حیا بڑھنے نہیں دیتی ارادہ نوجوانی کا
اشارہ ہو کے رہ جاتا ہے ہم پر مہربانی کا

کبھی آغوش میں رہتا کبھی رخسار و لب پر
کاش اے آفت جاں میں ترا آنسو ہوتا

منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند
دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

صلح کے بعد جو سوچا تو یہ بولا کافر
ہائے منہ دیکھے گا آکر وہ مسلماں میرا

کیوں ڈراتے ہیں یہ واعظ کہ خبردار رہو
کیا جہنم بھی کوئی کوچۂ جاناں ہوگا

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک
آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

جب میں بیتابی سے گھبرایا تشفی اس نے کی
مونس جان حزیں شب بھر ترا اقرار تھا

بیکسی اپنی وہ رونا ترا
مجکو ہنگام سفر یاد آیا

نام سنتے ہی مرا شرما گئے
تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

وائے قسمت کہہ رہے ہیں دور ہی سے دیکھ کر
کس لئے تکلیف کی ہے آپ فرمائینگے کیا

اللہ ری بیکسی کہ یہ نوبت ہے آجکل
ارمان تک بھی دل سے ہمارے نکل گئے

آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فزا ہیں لب
شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

ہوتی ہیں جوش عشق میں جو شکایتیں
کہتا ہے ناز سے وہ بت سیم تن درست

ہاتھ میں خنجر کمر پر تیغ تیز
یہ ارادے ایک مشت خاک پر

کس کس مصیبتوں سے ہوئی ہے نصیب مرگ
کیا کیا اٹھائے ہیں شب غم میں قضا کے ناز

دیکھ او قاتل بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم
چارہ گر سے درد نالاں درد سے دل دل سے ہم

برق نے اک طرز بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں

شوقِ شراب و خواہشِ جام و سبو نہیں — سب ہے حرام جب سے کہ پہلو میں تو نہیں

اچھا اچھا عدو سے ملئے — جاؤ جاؤ اجی بلا سے

ارمان نکل جائیں کچھ عاشقِ مضطر کے — آنسو نہ مرے پونچھو رو لینے دو جی بھر کے

سفر ہے دشوار خواب کب تک بڑی منزل عدم ہے — نسیم جاگو کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

یہاں تک تھی حریصِ نالہ بلبل — نکالی بیضہ سے منقار پہلے

نصیر

نصیر الدین عرف میاں کلّو لقب شاہ نصیر تخلص نصیر ولد شاہ غریب اللہ۔ سجادہ نشین۔ باشندہ دہلی۔ شاگرد حضرت میر محمدی مائل۔ آپ ایک زبردست استاد شاعر تھے اور آپ کے شاگرد بڑے بڑے استادوں کی قطار میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت ذوق اور مومن آپ کے ہی تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ نے انگریزی عملداری میں زندگی بسر کی۔ لیکن آپ کی شاعری شاہ عالم کے دور میں خوب چمکی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ کو سیر و سیاحت کا بھی بڑا شوق تھا۔ جنوب میں حیدرآباد اور مشرق میں لکھنؤ تک پہونچے۔ حیدرآباد میں دیوان چندولال کا دور دورا تھا وہاں آپ کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوا۔ اور خوب انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر پھر دہلی لوٹ آئے۔ تین مرتبہ پھر حیدرآباد گئے۔ آپ دو مرتبہ لکھنؤ گئے اور چار مرتبہ حیدرآباد۔ آخری مرتبہ سنہ ۱۸۴۰ء میں حیدرآباد میں ہی انتقال کیا۔ آپ اکثر مشکل زمینوں میں کلام کہتے تھے۔

دیکھا جو سیمتن تری تصویر کا ورق — سمجھا دل اس کو نسخۂ اکسیر کا ورق

لیلیٰ نے خط کو کھول کے قاصد سے یہ کہا — ہے یہ کسی کے عاشقِ دلگیر کا ورق

کیوں سطرِ کہکشاں سے مزیّن نہ ہو فلک — ق — ہے یہ کتابِ کاتبِ تقدیر کا ورق

تب اس نے عرض کی کہ اسے دیکھئے یہ ہے — احوالِ قیسِ پائے بہ زنجیر کا ورق

سودا نے دیکھ کر ترے دیوان کو نصیر — پھاڑا بیاضِ منتخبِ میر کا ورق

قدم نہ رکھ مری چشمِ پُر آب کے گھر میں
بھرا ہے موجِ طوفاں حباب کے گھر میں

کہے ہے دیکھ کے وہ عکسِ رخ یہ ساغرِ مے
نزولِ ماہ ہوا آفتاب کے گھر میں

ہمارے دل میں کہاں آبلے ہیں یہ ساقی
چھپے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں

تڑپ کو دیکھ مرے دل کی برقِ آتش بار
خجل ہو چھپ گئی آخر سحاب کے گھر میں

نصیر دیکھ تو کیا جلوۂ خدائی ہے
ہمارے اس بتِ خانہ خراب کے گھر میں

چل اس کوچے میں فوجِ اشکِ چشمِ تر سمیت
بادشاہِ ملکِ تن ہے تو نکل لشکر سمیت

کیوں نہ ہم شیشے کو ٹپکیں باغ میں ساغر سمیت
توڑتا گلچیں ہے غنچہ کو گلِ احمر سمیت

دیکھی آدھی رات کو مانگ اسکی جب جھومر سمیت
کٹ گئی تب کہکشاں دنبالہ دارِ اختر سمیت

ناف کے حلقے سے بچ اُس بحرِ خوبی کے دلا
ڈوبتی کشتی ہے اس گرداب میں لنگر سمیت

تو نے کیوں صیاد پھینکا لاشۂ بلبل کو آہ
داب دینا تھا کہیں گلشن میں بال و پر سمیت

حسن سے آگاہ اگر مغرور خوبوں کو کیا
گاڑ ہی دینا تھا آئینہ کو اسکندر سمیت

گو ہیں یارو پیر ہم پر عشق سے خالی نہیں
رکھتے ہیں خاکسترِ افسردہ کو اخگر سمیت

پائے بوسی پر نہ جا اے شمع تو گلگیر کے
عاقبت یہ تاجِ زر آلودہ لیگا سر سمیت

کب دل ہے پھپھولوں سے ہمارا ہمہ تن چشم
نظارۂ ساقی کو ہے مینا ہمہ تن چشم

اے تیر فگن ہم ترے ہاتھوں کے ہیں قرباں
تودے کی طرح ہم کو بنایا ہمہ تن چشم

برقع کو الٹ منھ سے جو تو کرتا ہے باتیں
اب ہیں ہمہ تن گوش بنو یا ہمہ تن چشم

قیامت آپ کا قد اس کے دلپذیر ہوا
چھڑی لے سروِ چمن بے نوا فقیر ہوا

کمان و تیر کا مجکو ربط تھا اس سے
جب اس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

اس شعلہ خو کی بزم میں مت کھیل جان پر
اے شمع لا نہ حرفِ شرارت زبان پر

ٹوٹا ہے عشق یوں ترے اس ناتواں پر — گرتا ہے جس طرح سے ہما استخواں پر
کیا اسی تمغہ کے قابل یہ گنہگار تھا آہ — تم مرے قتل کو لائے جو سفر سے تلوار
دم چرانے کا گماں یہ ہے کہ کرتا ہے تیز — مری تربت کی سدا لوحِ حجر سے تلوار

وقتِ نماز ہے ان کا قامت گاہ خدنگ و گاہ کماں
بن جاتے ہیں اہلِ عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں
مرد جوانی میں تو ہے سیدھا پیری میں جھک جاتا ہے
قوت و ضعف کی ہے یہ علامت گاہ خدنگ و گاہ کماں

اس لب کا لیا بوسہ نہ کبھو ہیہات نہ لپٹا پاؤں سے
دل تجھ سے برنگِ پان و حنا یہ کبھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا
مجنوں تو پھرا جنگل جنگل فرہاد نے چیرا کوہ ولا
میں آہ رہا بے دست و پا یہ کبھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا

اشعار متفرق

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر
اٹھ کہیں بیدار ہو کس نیند سوتا ہے نصیر — ہے سفر در پیش غافل فکرِ زادِ راہ کر
ناداں تلاشِ دانہ نہ کر مثلِ آسیا — ایسا نہ ہو کہ تجکو جہاں میں پھرائے حرص
طوفاں ہے اس دیدۂ پر آب کی گردش — پانی بھرے ہے دیکھ کے گرداب کی گردش
خاک اب پروانہ دل سوز رکھے تجھ سے حشم — تیری آنکھوں پر تو چربی چھا گئی اک بار شمع
دم غنیمت ہے کوئی دم کی یہ صحبت ہے حبیب — تجھ سے پھر ملنا خدا جانے ہمارا ہو نہ ہو
پایا نصیر گلشنِ ہستی سے یہ ثمر — بارِ گنہ سے صورتِ شاخِ خمیدہ ہوں
اس کے تیروں سے ہیں یوں سرخ لہو سے پیکاں — جیسے شاخوں پہ نظر آئیں چمن میں مرچیں
زلف میں دل جو گرفتار نظر آتا ہے — بال بال آہ گنہگار نظر آتا ہے

کب چشمِ یار سے ہو دلِ زار کا علاج بیمار سے ہوا نہیں بیمار کا علاج

نظیر

نام شیخ ولی محمد متخلص نظیر (اکبرآبادی) آپ ۱۷۴۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ اپنے والدین کے تنہا لڑکے تھے۔ لہذا بڑے لاڈ پیار میں پرورش پائی۔ بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ (اکبرآباد) چلے آئے اور محلہ تاج گنج میں رہائش اختیار کرلی۔ یہیں آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ نواب سعادت علی خاں نے آپ کو لکھنؤ بلوایا۔ مہاراجہ بھرت پور نے بھی آپ کو بُلایا۔ مگر آپ کہیں نہیں گئے۔ آگرہ میں ہی معلمی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ آپ کا مجموعہ کلام بعنوان "کلیاتِ نظیر" شائع ہو چکا ہے جسمیں مختلف عنوانات پر نظمیں شامل ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔

گلزار ہے داغوں سے یہاں تن بدن اپنا کچھ خوف خزاں کا نہیں رکھتا چمن اپنا

اشکوں کے تسلسل نے چھپایا تنِ عریاں یہ آبِ رواں کا ہے بنا پیراہن اپنا

کس طرح بنے ایسے سے انصاف تو ہے شرط یہ وضع مری دیکھو وہ دیکھو چلن اپنا

انکار نہیں آپ کے گھر چلنے سے مجکو میں چلنے کو موجود جو چھوڑو چلن اپنا

مسکن کا پتا خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو جس جا پہ کہ بس کر رہے وہ ہے وطن اپنا

ہرگز نہ پلا مے تو مجھے آنکھ بدل کر ساقی ترے کوچہ سے نہ جاؤں گا سنبھل کر

میں کشتۂ ابرو ہوں ترا اے مرے قاتل آئے ہو لئے ہاتھ میں کیوں تیغ مچل کر

جب ہم سے خفا ہو کے وہ جاتا ہے شمع رو خاموش ہو رہ جاتا ہوں پروانہ سا جل کر

میں عاشقِ بیدل ہوں ترا اے مری جانی مت آنکھ چُرا مجھ سے تو ایسا نہ خلل کر

کہتا ہے نظیر اس کو تو پیار سے سوجا تب اٹھ کے کھڑا ہوتا ہے وہ شوخ اچھل کر

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں
مے کہیں شیشہ کہیں ساقی کہیں جام کہیں

دل کی بیتابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھے
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

ایک دل دیجئے کس کس کو سبھی مانگتے ہیں
بندے اور بالے کہیں زلف سیاہ فام کہیں

نامہ بر نامہ لکھوں یہ ہیں زبانی کہدوں
خط کے پرزے پہ لکھوں قاصدا اب نام کہیں

دل بھی اور جان کفایت نے سبھی کی ہے نظیر
گل کہیں غنچہ کہیں بلبل بدنام کہیں ہے

نظم "برسات" چند بند

اہل سخن کو ہیگا اک بات کا تماشا
اور عارفوں کی خاطر ہے ذات کا تماشا

دنیا کے صاحبوں کو دن رات کا تماشا
ہم عاشقوں کو ہیگا سب گھات کا تماشا

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

قاصد صبا کے دوڑے ہر سمت منہ اٹھا کر
ہر کوہ و دشت کو بھی کہتے ہیں یہ سنا کر

ہاں سبز جوڑے پہنو ہر دم نہا نہا کر
کوئی دم کو میگھ راجا دیکھے گا سب کو آکر

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ساون کے بادلوں سے پھر آ گھٹا جو چھائی
بجلی نے اپنی صورت پھر آن کر دکھائی

ہو مست رعد گرجا کوئل کی کوک آئی
بدلی نے کیا مزے کی رم جھم جھڑی لگائی

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہر کوہ کی کمر تک سبزہ ہے لہلہاتا
برسے ہے منہ جھڑا جھڑ پانی بہا ہے جاتا

وحش و طیور ہر اک مل مل کے ہے نہاتا
غوغا کریں ہیں مینڈک جھینگر ہے غل مچاتا

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

گلشن میں آ بھرے ہیں سب گلبدن نکیلے
ساتھ ان کے لگ رہے ہیں عاشق جو ہیں رنگیلے

کہتا کوئی کسی سے اے دلربا چھبیلے
اب کے گلابی مے کی ہاتھوں سے میرے پی لے

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے
جگنو چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے

لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے
گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

نظم روضہ تاج گنج آگرہ

یارو یہ تاج گنج جو یہاں آشکار ہے — مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے — روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
نقشہ میں یہ بھی عجب خوش نگار ہے

روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں یہاں — پر اس مکاں کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
سنگ سفید سے جو بنا ہے قمر نشاں — ایسا چمک رہا ہے تجلّی سے یہ مکاں
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے

گنبد میں اس کا زور بلندی سے بہرہ مند — گرد اس کے گمذیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
اور وہ کلس جو ہے سر گنبد سے سر بلند — ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
ہر ماہ جس کے خم پہ مہہ نو نثار ہے

دیواروں پر ہیں سنگ میں نازک عجب نگار — آئینے بھی لگے ہیں مجلّے و تابدار
دروازہ پر لکھا ہے خط طغرا طرفہ کار — ہر گوشہ پر کھڑے ہیں جو مینار اسکے چار
چاروں سے طرفہ اوج کی خوبی دوچار ہے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دل کشا — آتی ہے جس میں گلشن فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف صبا — ہلتی ہیں ڈالیاں بھی ہر گل ہے جھومتا
کیا کیا روش روش پہ ہجوم بہار ہے

وہ تاجدار شاہجہاں صاحب سریر — بنوایا انہوں نے لگا سیم و زر کثیر
جو دیکھتا ہے اس کو وہ ہوتا ہے دلپذیر — تعریف اس مکاں کی میں کیا کیا کروں نظیرؔ
اس کی صنعت تو مشتہر روزگار ہے

واسوخت (دو بند)

نہ تھا معلوم الفت میں کہ غم کھانا بھی ہوتا ہے — جگر کی بے کلی اور دل کا گھبرانا بھی ہوتا ہے
سسکنا آہ کرنا اشک بھر لانا بھی ہوتا ہے — تڑپنا لوٹنا بیتاب ہو جانا بھی ہوتا ہے
کیے پر اپنے آخر کو یہ غم کھانا بھی ہوتا ہے — کف افسوس کو مل مل کے پچھتانا بھی ہوتا ہے

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را | نمی کردم بہ دل روشن چراغِ آشنائی را
کوک کروں تو جگ ہنسے اور چپکے لاگے گھاؤ | ایسے کٹھن سنیہہ کو کہہ ید کروں اُپائے

مرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ چل تو یار کے ڈیرے | اُدھر تن مجھ کو کہتا ہے تو دکھ مجکو مت دے رے
جو کہنا دل کا سنتا ہوں تو وہ رہتا ہے گھر تیرے | اگر تن کی سُنوں باتیں تو پھر دکھ دے وہ بہتیرے
نہ دل ملنے نہ تن ملنے ہر اک اپنی طرف پھیرے | کروں کیا اے نظیر ایسی جو مشکل آن کر گھیرے
دلم دلداری جوید تنم آرام می خواہد | عجائب کشمکش دارم کہ جانم مفت میکاہد
دل چاہے دلدار کو تن چاہے آرام | دبدھا میں دونوں گئے نہ مایا ملی نہ رام

نوازش

نام نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی متخلص نوازش۔ خلف حسین علی خاں ابن نواب ناصر خاں۔ باشندہ لکھنؤ شاگرد میر سوز۔ آپ کا کلام کمیاب ہے۔

ایک عالم کو آزما دیکھا | جس کو دیکھا تو بے وفا دیکھا
حالِ بد کا شریک دنیا میں | نہ برادر نہ آشنا دیکھا
کیف میں کم بہت نوازش ہے | عشقِ خوباں میں جو نشا دیکھا

ایامِ وصل میں ہم لپٹے ہیں جیسے اس سے | یوں وصلی کے بھی کاغذ چسپاں بہم نہ ہونگے
آغازِ عشق ہی میں شکوہ بتوں کا اے دل | ٹک صبر کر ابھی تو کیا کیا ستم نہ ہونگے

اشعار متفرق

عشق میں ایک خلل سا تہ لگا رہتا ہے | اشک چل نکلے نوازش جو کبھی دل ٹھہرا
زلبس رہتا ہے آنے کا اس کے دھیان لگا | صدائے در پہ ہے در پردہ وہ اپنا کان لگا
یہ بلی کرتا ہے تو نوکِ مژہ کی آبداری پر | تجھے بھی طنطنہ کتنا ہے اتنی سی کٹاری پر
وہ گئے دن جو بسر شب ہو ہم آغوشی میں | اب تو کٹتی ہے مری چار پہر آنکھوں میں
یہ سانس ہے پیکاں ہے یہ نشتر ہے کہ دل ہے | کانٹا سا کھٹکتا ہے یہ کیا دیکھیو بر میں
بن ہاتھ لگے دس کے جاتے نہیں ہلتا میں | لاغر اسے کہتے ہیں بیمار اسے کہتے ہیں

حرام نیند کی اقرارِ وصلِ جاناں نے
الٰہی کوئی کسی کا امیدوار نہ ہو

یہ جانتے تو نہ باتوں کی مجھ سے خو کرتے
ترے خیال میں پہروں ہی گفتگو کرتے

ایک میں کیا خوب کر دیکھے اسے حسن آفریں
اپنی صنّاعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا
کوئی کسی کا نہیں دوست سب کہانی ہے

وحشت

مولوی حافظ رشید النبی متخلص وحشت ولد مولوی حافظ حبیب النبی متوطن رام پور۔ آپ کلکتہ ہگلی میں عہدہ جلیلہ پر مامور تھے۔ آپ حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد اور عبدالغفور نسّاخ کے استاد تھے۔ عربی اور فارسی میں اچھا کلام کہتے تھے۔ عین عالم شباب میں ۱۲۷۴ھ میں انتقال کیا۔

خوں تھوکتا ہوں الفتِ ابروئے یار میں
لکھا ہے طبیب مری دوا میں ہرن کی شاخ

گیسو ہیں مشک آنکھیں چکاری مژہ ہیں تیر
دنبالہ دار سرمہ ہے گویا ہرن کی شاخ

بیٹھے جو ہاتھ رکھ کے وہ گلرو تہِ ذقن
پیدا ہو باغِ حسن میں سیبِ ذقن کی شاخ

پہونچی نہیں ہے آہِ شرربار تا فلک
پھوٹی ہے جوشِ اشک سے چرخِ کہن کی شاخ

جو کج ہیں ان کو صدمۂ حرماں نصیب ہے
دیکھی ہے کس نے پھولتے پھلتے ہرن کی شاخ

رکھتے نہیں وہ رشک تو ہنگامِ تکلّم
مصری کی ڈلی صاف چبا جاتے ہیں کیسے

مشتاق سمجھ کر مجھے پردے میں ستم کے
باتیں سرِ محفل وہ بنا جاتے ہیں کیسے

گلچیں کی طرح یا کسی دیوانہ کی صورت
بتلا کہ وہاں بادِ صبا جاتے ہیں کیسے

حیراں ہیں اگر آپ تو آئینہ میں دیکھیں
پھندے میں کسی زلف کے آ جاتے ہیں کیسے

وہ سبزۂ خط عالمِ وحشت میں دکھا کر
توتے مرے ہاتھوں کے اڑا جاتے ہیں کیسے

رونقِ بزمِ شراب آج وہ جانانہ ہوا
سر جو شیشے کا جھکا سجدۂ شکرانہ ہوا

پرتو افگن جو کبھی ساعدِ جانانہ ہوا
ہر حباب لب جو شاہدِ پروانہ ہوا

مشتری کون ہوا اس مہہ کا جو بے مہری سے — نقدِ جاں لیکے یہ کہتا ہے کہ بیعانہ ہوا
پاؤں میں سلسلۂ زلفِ پریشاں الجھا — اپنے ہی دام میں پابند وہ جانانہ ہوا

مہتابی یہ جلوہ ہے جو اس رشکِ پری کا — عالم ہے رُخِ سیہہ یہ چراغِ سحری کا
چشمِ آہو کے انداز قدم کبکِ دری کا — رُخ مہہ کا ہے قد سرو کا نقشہ ہے پری کا
عریانی میں کیا نذر کروں دستِ جنوں کو — دامن بھی جو رکھتا ہوں تو زخمِ جگری کا

کھینچئے موئے میاں طبعِ رسا سے پیدا — بال ہوں چشمِ تصور میں بلا سے پیدا
زخمِ دل پر نمک افشاں ہے فراقِ احباب — شور سر میں ہے مری بانگ درا سے پیدا
چشمِ انساں ہے مرا گھر کہ مثالِ مردم — رو سیاہی میں ہوں میں عین ضیا سے پیدا

شعلۂ عشق سے روشن دلِ مشتاق رہا — سینہ تا رگ پُر از حکمتِ اشراق رہا
حلقۂ زلف ہے یاں سلسلۂ آزادی — عین تقیید میں بھی یاں عالمِ اطلاق رہا
روئے جاناں کے تصور میں رہا سینہ گرم — برگِ گل بھی سببِ سوزشِ احراق رہا

نہیں باقی کوئی تارِ گریباں بھی مگر تن پر — کہ جا پڑتا ہے اب دستِ جنوں زخموں کے دامن پر
بجھایا ہے چراغِ زندگی تعویذِ گیسو نے — بجائے شمع ہو وے مار مہرہ اپنے مدفن پر
قدم باہر نہیں رکھتی نگہ آنکھوں کے پردے سے — حجابِ عشق گھونگھٹ ہے کسی کے روئے روشن پر

سبزہ پیدا ہے تو اب بزم میں جا دیتے ہیں — باغِ سبز اپنا بلا کر وہ دکھا دیتے ہیں
ان کا ادنیٰ یہ شگوفہ ہے کہ گلشن میں سدا — ہنستے ہنستے گل و بلبل کو لڑا دیتے ہیں
باندھ لیتے ہیں جو وہ دزدِ حنا ہاتھوں ہاتھ — دل چرا لینے کی یہ اس کو سزا دیتے ہیں

چین آتا ہی نہیں بے تکیۂ زانوئے یار — کیا نوشتہ ہے مری تحریر پشت آئینہ
دشت مشاطہ میں دے آئینہ اپنے ہاتھ سے — جرم بوسہ پر یہ ہو تعزیر پشت آئینہ
اس رخ صافی کی جس دم دیکھ پاتی ہے جھلک — آئینہ بن جاتی ہے تصویر پشت آئینہ

کب خیال حلقۂ جعد رسا ہوتا نہیں — کب دل دیوانہ پابند بلا ہوتا نہیں
دل سے کم سودائے چشم فتنہ زا ہوتا نہیں — شور محشر کون سی شب یاں بپا ہوتا نہیں
سینہ ہے آماجگاہ ناوک مژگان یار — کون سا دل زخمی تیر قضا ہوتا نہیں

فرط صفا سے جس کا ہر اک تل ہے آئینہ — منھ دیکھو اسکے مقابل ہے آئینہ
اے جان اب تمہارے رُخ کے مقابل ہے آئینہ — آئینہ اب دکھانے کے قابل ہے آئینہ
اے جان جاں فقیر کی صورت سوال ہے — یعنی صفا کا آپ سے سائل ہے آئینہ

صاد چہرے پہ ترے خامۂ قدرت نے لکھا — باعث چشم حسینوں میں تو ممتاز رہا
ہو کے برباد غبار تن لاغر اپنا — راکب دوش صبا صورت آواز رہا

مانگ میں سیندور ہے ان کی کہاں بالائے سر — سرخی رنگ کف پا ہے عیاں بالائے سر
شمع کا سر کاٹتے ہیں بزم میں گلگیر سے — آفتیں کیا کیا نہیں لاتی زباں بالائے سر

وزیر

خواجہ محمد وزیر تخلص وزیر۔ باشندہ لکھنؤ۔ خلف خواجہ محمد فقیر لکھنوی شاگرد حضرت ناسخ۔ آپ مسلم الثبوت شاعر تھے۔ ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔ آپ کے نسب کا سلسلہ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے۔

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر
اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اُس نے مرے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر
بناوٹ نے بگاڑا باتیں بنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منھ کی کھائی بے زباں ہو کر
وہ پیاسا ہوں لگا کر تیغ پر آب جب اس نے کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

گر الٹ کر دیکھئے تصویر پشت آئینہ
سیدھی ہو جائے ابھی تقدیر پشتِ آئینہ
کیجئے داخل دلِ بیتاب پارے کے عوض
روز سنئے نالۂ شبگیرِ پشتِ آئینہ
عکسِ روئے آتشیں نے صاف کشتہ کر دیا
کہئے اب سیماب کو اکسیر پشتِ آئینہ

مے دے کہ نہ دے بادۂ اطہر تو نہیں ہے
کچھ پیرِ مغاں ساقیِ کوثر تو نہیں ہے
کچھ معجزہ ختم آپ کے لب پر تو نہیں ہے
عیسیٰ ہے تو ہو اپنا پیمبر تو نہیں ہے
کہتے ہو مجھے خواب میں معراج ہوئی ہے
جبریل کا تکیہ میں کوئی پر تو نہیں ہے

گوہرِ اشک سے لبریز ہے سارا دامن
آجکل دامنِ دولت ہے ہمارا دامن
وصل کی رات ہے بگڑو نہ برابر تو رہے
پھٹ گیا میرا گریباں تمہارا دامن

چاہے اگر خدا تو ہر اک عیب ہو ہنر
موسیٰ کو دیدیا یدِ بیضا جلا کے ہاتھ
ہے آرزوئے قتل ابھی دم نہ دو مجھے
چھوٹا ہے نیچا تو لگا و بڑھا کے ہاتھ

جو کہ طائر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے
اے شہِ حسن وہ اڑتے ہی ہوا ہوتا ہے
ایک ذرّے کو نہیں ہوتی ہے جنبش بے حکم
بت جو پھر جاتے ہیں اللہ پھرا ہوتا ہے

حسنِ عارض عارضی تھا کھل گیا
خط کے آتے ہی لفافہ کھل گیا
خط پہ خط لائے جو مرغِ نامہ بر
بولے ان مرغوں کا دڑبا کھل گیا

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خوابِ ناز ہے
فتنہ تو سو گیا ہے درِ فتنہ باز ہے
کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا
بس دم نکل گیا جو سُنا بے نیاز ہے

اک عالم نے جبہہ سائی کی
اے بت تو تم نے بھی خدائی کی
نہ گئی زاہدوں کے پاس کبھی
دخترِ رز نے پارسائی کی

اپنے گناہ آ نہیں سکتے گناہ میں
زاہد کو خوف چاہیئے روزِ حساب کا
زاہد، حرام مے کو نہ کہنا وگرنہ میں
جنت میں چھین لوں گا پیالہ شراب کا

اشعار متفرق

جو کہتا ہوں ترا بیمار ہوں میں
تو کہتا ہے کچھ اپنی دوا کر
اٹھا اٹھا کے جو پردہ نگاہ کرتے ہیں
ہمارے دل میں وہ در پردہ راہ کرتے ہیں
کرتے ہو ذکر مرے دلِ بیقرار کا
منھ سے کہیں زباں نہ باہر نکل پڑے
آج مجھ سے بات اگر کرتے نہیں
دینگے یہ بت کل خدا کو کیا جواب
لڑکے ہاتھ اس کا چھڑانا شمع گل کرنا مرا
وصل کی وہ رات یاد آتی ہے اور وہ جنگِ شمع
ذرا سے جرم پہ جھانکے کنویں فرشتوں نے
یہ آدمی ہیں کہ کیا کیا گناہ کرتے ہیں
نہ خطِ مصحفِ عارض کا معتقد ہو وزیر
حروف جسمیں ہوں اللہ کا کلام نہیں
بیجا تلاشِ دولت و دنیا ہے اے وزیر
غیر از کفن نہ جائیگا شاہ و گدا کے ساتھ
پڑا ہے تفرقہ بیتابیوں سے
وزیر اب میں کہیں ہوں دل کہیں
یوسف جو کہا انھیں تو بولے
کیا آپ نے مول لے لیا ہے
قتل بے شمشیر او ظالم کیا
آئینہ دکھلا دیا دو ہو گئے
باتیں جو چکنی چکنی سنے میرے یار کی
زاہد تو کیا اس کا فرشتہ پھسل پڑے
ہوئی گر صلح بھی تو بھی رہی جنگ
ملا جب دل تو آنکھ اس سے لڑا کی

ولی

نام شمس الدین تخلص ولی باشندہ اورنگ آباد دکن۔ آپ اردو شاعری کے موجد مانے جاتے ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں شمالی ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ ۱۷۰۷ء میں انتقال کیا۔

تجھ بت کی صنعت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا ۔۔۔ جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی ۔۔۔ جا کشورِ ایراں میں سلیماں سے کہوں گا
میں جب سے دکھا خواب ہے اے مایۂ خوبی ۔۔۔ اس خواب کو میں یوسفِ کنعاں سے کہوں گا
تعریف ترے قد کی الف دار اے ساجن ۔۔۔ جا سروِ گلستاں کو خوش الحاں سے کہوں گا
بے تاب نہ ہو شور سے تو اے ولی ہرگز ۔۔۔ اس درد کی دارو کسی درماں سے کہوں گا

وہ صنم جبکہ بسا دیدۂ حیران میں آ ۔۔۔ آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ
یار دیتا نہیں گر رخصتِ گلگشتِ چمن ۔۔۔ اے چمن زارِ حیا دل کے گلستان میں آ
دیکھ اے اہلِ نظر سبزۂ خط میں لبِ لعل ۔۔۔ رنگِ یاقوت چھپا ہے خطِ ریحان میں آ
حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد ۔۔۔ طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیبِ بدخو ۔۔۔ دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سے ہمراہ ہے پریشانی میں ۔۔۔ درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ
غم سے تیرے ہے ترحم محل حالِ ولی ۔۔۔ ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ انسان میں آ

سن تو دل کیوں تو پڑا اس بتِ عیار کے ہاتھ ۔۔۔ کوئی آتا ہے بھلا ایسے ستمگار کے ہاتھ
بوسے ان ہاتھوں کے لیتا ہوں میں ہر دم ہر آن ۔۔۔ کیونکہ مدت سے رہے ہاتھوں میں دلدار کے ہاتھ
دام میں آن کے صیاد سے بلبل نے کہا ۔۔۔ بیچنا مجھ کو کسی آئینہ رخسار کے ہاتھ
جلد پھر اس کو ملا دے یا مجھے دور رکھے ۔۔۔ ایسی ہے بات مری حضرتِ غفار کے ہاتھ

حشر کا خوف وؔلی کو نہیں ہے واللہ — ہے شفاعت یہ واں احمدِ مختار کے ہاتھ

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروشِ دل کی ماہیت — برنگِ ابرِ دریا بار ہے رومال عاشق کا
وؔلی یوں مصرعِ رنگیں ہوا ہے دردِ جان و دل — خلا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

چاہتا ہے اس جہاں میں گر بہشت — جا تماشا دیکھ اس رُخسار کا
اے وؔلی کیوں سن سکے ناصح کی بات — جو ہے دیوانہ پری رُخسار کا

اشعار متفرق

جاری ہوئے آنسو مرے یوں سبزۂ خط دیکھ — اے خضر قدم سیر کر اس آبِ رواں کا
کہتا ہے وؔلی دل سیتی یہ مصرعِ رنگیں — ہے یاد تری مجکو سبب راحتِ جاں کا
آوے وؔلی ہماری طرف تیغِ ناز سے — اس شوخ کو خیال اگر ہے سنگار کا
نہ پوچھو اب ہوا ہے کم سخن وہ دلبرِ رنگیں — لبِ تصویر پر ہے رنگ دائم لاجوابی کا
ہوش کھوتی ہے نازنین کی ادا — سحر ہے سروِ گل جبیں کی ادا
از بسکہ زندگی میں یوں محو ہوں وؔلی — مشکل ہوا اجل کو کرنا سُراغ میرا
مجھے بولا کہ گر عشقِ حقیقی سے ہے ناواقف — تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا
اے وؔلی گلبدن کو باغ میں دیکھ — دلِ صد چاک باغ باغ ہوا
پھر میری خبر لینے صیّاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
نقشِ دیوار کیوں نہ ہو عاشق — حیرت افزا ہے بے وفا کی ادا
شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی کا کیا مجازی کا
ٹھہرے نہ ایک دم بھی خجالت سے آگ پر — میری طرح جلے جو کلیجہ کباب کا
جنت میں کب دیا ہے وہ رضواں کو مرتبہ — جو مرتبہ ہے تیری گلی میں مقیم کا
نور کلاہ ہے گنج تیرا یہ جمال — حُسن کے گوہر کا تو معدن ہے
کرتا ہے اس کی زلف کی تعلیم اے وؔلی — جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا

اے ولی دل کو آب کرتی ہے — نگہۂ چشم سرمگیں کی ادا

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا — چین میں ہے شور حسن کے ابروئے پرچین کا

ولی ایران و توران میں ہے مشہور — اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

لگے چھیکی نظر میں اے ولی دوکانِ حلوائی — اگر ہو جلوہ گر بازار میں شیریں سخن میرا

شہرت ہوئی جب سوں ترے شعر کی ولی — مشتاق تجھ سخن کا عرب تا عجم ہوا

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سناؤ — رکھتا ہے فکر روشن جو الوری کی مانند

عجب نہیں جو مصنف یہ آفریں بولے — ولی جو کوئی سنے اس وضع کی یہ تصنیف

تیرے سخن کی نغمۂ رنگیں کو سن ولی — ڈوبا عرق کے بیچ عراقی عراق میں

جنونِ عشق ہوا زمیں کو اس قدر محیط — کہ پارسا کو ہوئی موجِ بوریا زنجیر

ہوں گرچہ خاکسار ولے از راہِ ادب — دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

اے جان ولے وعدۂ دیدار کو اپنے — ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — عشق کا اعتبار کھوتی ہے

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عشق — کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

ترک کر اے رقیب فرعونی — آہ میری عصائے موسیٰ ہے

ہدہد

مولوی عبدالرحمٰن ہدہد۔ باشندہ دہلی پیشہ معلمی۔ شاگرد حکیم آغا خان عیش۔ آپ کا کلام طنز و مزاح سے بھرپور ہوتا ہے۔

رباعی

ہدہد کا ہے مذاق نرالا سب سے — انداز ہے اک نیا نکالا سب سے

سر دفترِ لشکر سلیمان ہے یہ — اڑتا بھی ہے دیکھو تو یہ بالا سب سے

راست آئینوں کو نفرت ہے کج آئینوں سے — تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا

آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہدہد آیا — غل پڑا پیش رو ملک سلیماں آیا

قطعہ در مدح بہادر شاہ ظفر

(صرف چار شعر دستیاب ہو سکے ہیں)

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کر دوں
تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھونسلا کر دوں

جو آ کے ریز کرے میرے آگے موسیقار
تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سرا کر دوں

جو سرکشی کرے آگے مرے ہما آکر
تو اس کے نوچ کے پر شکلِ نیولا کر دوں

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے
فلک کہے ہے مقرر میں باجرا کر دوں

قصیدہ سُن کر بادشاہ سلامت بہت خوش ہوئے اور طائرُ الاراکین۔ شہیر الملک، ہدہدالشعرا اور منقار جنگ کے القاب سے آپ کو نوازا۔ اور سات روپیہ ماہوار آپ کے مقرر کر دئے۔

ایک سال کثرتِ بارش سے آپ کا مکان تباہ ہو گیا۔ گھونسلے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرے مگر مکان ہاتھ نہ آیا۔ مجبور ہو کر بادشاہ سلامت کے حضور میں عرضی گذاری۔

عرضی کے چند شعر

جز ترے شاہنشاہ کہہ کس کے آگے روئیے
کس سے کہئے جا کے یہ غم کو ہمارے کھوئیے

تجکو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار
ہے بجا کر سمندِ طبع کو یاں پوئیے

حیف آتا ہے کہ فنِ شعر میں کیوں کھوئی عمر
کاش کہ ہم سیکھتے اس سے بنانے بوئیے

سنگلاخ ایسی زمیں ہے سوچ اے دل تا کجا
فکر کیجے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے

رشتۂ عمرِ شہنشاہِ جہاں ہووے دراز
یا خدا کھلتے رہیں دنیا میں جب تک موئیے

دیدے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن کر گھونسلے
مارتا پھرتا ترا ہدہد ہے ٹامک ٹوئیے

ایک سال سرکارِ شاہی سے تنخواہ میں تاخیر ہو گئی۔ ایک قطعہ راجہ دیبی سنگھ کی مدح میں تیار کر کے پیش کیا۔ فوراً تنخواہ سپرد ہو گئی۔ راجہ دیبی سنگھ بہادر شاہ ظفر کے یہاں خازن تھے۔

قطعہ

جہاں میں آج دیبی سنگھ تو راجوں کا راجا ہے
خدا کا فضل ہے جو تو قلعہ میں آ بیٹھا ہے

سلیماں نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی
تو سرداروں کا سردار اور تمہارا راجوں کا راجا ہے

شکم اہل جہاں کے سب ہیں شکر اپنے بجا لاتے
دمامہ تیرا جا کر گنبد گردوں پہ بجا ہے

کسی کو دے نہ دے تو مختار ہے اس کا
مگر ہدہد کو دیدے کیونکہ یہی ہدہد کا کھاجا ہے

یاروں نے ہدہد کے مقابلہ میں ایک باز تیار کیا اور اسے محفلوں میں اڑانا شروع کر دیا۔ ہدہد نے باز کی ہجو میں کچھ شعر کہہ کر اسے ایسا اڑایا کہ پھر کہیں نظر نہیں آیا۔

ہجو کے چند شعر

جسے کہتے ہیں ہدہد وہ تو نر شیروں کا دادا ہے
مقابل تیرے کیا ہو تو تو اک جرّہ کی مادہ ہے

گر اب کے باز ڑی میداں میں آئی سامنے میرے
تو دُم میں پر نہ چھوڑوں گا یہی میرا ارادہ ہے

مقرر باز جو اپنا تخلص ہے کیا تو نے
ہوا معلوم یہ اس سے کہ تیرا گھر کشادہ ہے

ادب اے بے ادب اب تک نہیں تجکو خبر اس کی
کہ ہدہد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

اس کے بعد یاروں نے مقابلہ میں ایک زاغ تیار کیا۔ ہدہد نے اس کی بھی خوب خبر لی اور آندھی میں اُڑا دیا۔

جون آیا ہے بدل اب کے عدو کوّے کی
اسکی ہے پاؤں سے تا سر وہی خو کوّے کی

وہی ساں کاں وہی کیں کیں وہی ٹاں ٹاں اس کی
بات چھوڑی نہیں ہاں اک سر مو کوّے کی

پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوّا ہوگا
پھر یہ معلوم ہوا ہے یہ بہو کوّے کی

بن کے کوّا جو یہ آیا ہے تو ہدہد شاہ
دم کتر دینے کو کچھ کم نہیں تو کوّے کی

ہوس

مرزا محمد تقی خاں متخلص ہوسؔ خلف مرزا علی خاں بن نواب سالار جنگ باشندہ فیض آباد۔ شاگرد مصحفی۔ صاحب دیوان و صاحب مثنوی لیلیٰ مجنوں ہوئے ہیں

آپ اپنے اشعار میں لیلیٰ مجنوں کے مضامین زیادہ تر باندھتے تھے۔

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں، نہیں کھائی ادب سے خدا کی قسم
غمِ قیس سوا مجھے کچھ نہیں غم، اسی کشتۂ ناز و ادا کی قسم

دُکھ پایا جو لیلیٰ نے مجنوں کا جی، کہا کیوں ہے خفا مرے سرد سہی
نہ تو میں نے کسی سنگ بات بھی کی، مجھے میری ہی شرم و حیا کی قسم

مرے گریہ سے جاوے ہے صبر و سکوں، مرے اشکوں سے ٹپکے ہے قطرۂ خوں
نہ کھائیو قمریِ زار و زبوں، مرے سرو کے خندقِ پا کی قسم

شبِ ہجر میں اشکوں کا خوں بہا، اسے دیکھ کے رنگِ شفق کا اڑا
نہیں اس میں مبالغہ اک ذرا، مجھے تیرے ہی رنگِ حنا کی قسم

ترے کشتۂ غم کا ہے حال بتر یہی کہیو جو جانا ہو تیرا اُدھر
تجھے قاصدِ موجِ نسیم سحر مری ہجر کی شب کی بُکا کی قسم

کبھی کہتا تھا قیس غزالوں سے جا، کہو ناقہ اِدھر سے کدھر کو گیا
کبھی کہتا تھا تو ہی بتا دے صبا، تجھے لیلیٰ کی زلفِ دوتا کی قسم

کبھو ساغرِ وصل نہ میں نے پیا، کبھی زخمِ جگر کو نہ میں نے سیا
غم و رنج و تعب کو عزیز کیا، مجھے عشق کے جور و جفا کی قسم

نہ پاتی ہوس کبھی پھولوں کی بو، نہ تو بیٹھا ہوں میں کبھی برلبِ جو
نہ تو بیکلی دل کی گئی ہے کبھو، مجھے جانی کی اپنی وفا کی قسم

ہوئے عازمِ ملکِ عدم جو ہوس تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
یہ فراغِ الم سے وہاں بھی نہ تھا وہاں غم یہ ہوا کہ وہ ہم سے چھٹے

کبھی دیر میں تھے کسی بُت پہ فدا کبھی کعبہ میں کرتے تھے جا کے دُعا
ترے در پہ جو بیٹھے تو خوب ہوا کہ کشاکشِ دیر و حرم سے چھٹے

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں کہ فراق کی اب اسے تاب نہیں
ملوں اس سے کہ تا مرا قیس حزیں غمِ ہجر کے درد و الم سے چھٹے

تونے رعنائی کی قامت جو دکھائی مجکو ۔ روشِ سروِ چمن پھر نہ خوش آئی مجکو
دل مرا سینہ میں جوں برق ہے شب بیتاب ۔ کس لئے یاد اس کے تبسّم کی دلائی مجکو
ہاتھ سے آبلہ پائی کے بہ تنگ آیا ہوں ۔ کوچۂ یار تلک کب ہو رسائی مجکو
جان گر تن سے جدا ہو تو جدا ہو لیکن ۔ جان منظور نہیں تیری جدائی مجکو
باغِ ہستی کی وہیں سوجھ گئی کیفیت ۔ مئے گلرنگ جو ساقی نے پلائی مجکو
نہ ہوئی غم سے کسی طرح رہائی ہیہات ۔ وصل کے دن بھی رہا خوفِ جدائی مجکو
بیٹھکر پہلو سے میرے جو گیا اٹھ وہ ہوسؔ ۔ فتنہ برپا ہوا آفت نظر آئی مجکو

اشعار متفرق

نزع میں ہم نے عجب طرح سے دل شاد کیا ۔ آئی ہچکی تو کہا اس نے ہمیں یاد کیا
دی دردِ عشق نے مجھے غم میں بھی اک خوشی ۔ رونے پہ میرے دیر تلک وہ ہنسا کیا
محفل میں ساتھ لے نہ گیا کیوں نشانِ درد ۔ سینہ سے میں نکال کے پیکاں خجل ہوا
بلبل نے کڑھایا نہ غمِ گل نے رولایا ۔ مجکو تو فقط اس کے تغافل نے رولایا
بالیں پہ دمِ نزع وہ خود کام نہ آیا ۔ مرنا بھی مرا ہائے مرے کام نہ آیا
دردِ دل سے تو کسی کو ہوسؔ آگاہ نہ کر ۔ شرطِ الفت تو یہ ہے جان دے اور آہ نہ کر
کہتا ہے دیکھ کوچے میں مجکو وہ سنگ دل ۔ دلوانے سے کرے کوئی کیا پتھر اختلاط
کرو کچھ شکل ایسی جس میں راہِ عشق طے ہووے ۔ ہوسؔ گر لاکھ فن کے تم ہوئے استاد کیا حاصل
رنجش کا انہوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے ۔ مجھ سے وہ بگڑتے ہیں جب خوب سنورتے ہیں
کیا کیا نہ رنج ہم پہ ترے بن گزر گئے ۔ اب چلا آ کہیں کہ بہت دن گزر گئے
غلطی باہم جو جوانی میں کبھی ہوتی تھی ۔ مطلبِ اظہار دکھائی میں کبھی ہوتی تھی
مجنوں سے ہوسؔ ہووینگے ہم جا کے مقابل ۔ تھوڑی سی توانائی بھی ہم کو اگر آئی

یقین

نام اللہ خاں تخلص یقینؔ خلف اظہر الدین خاں شاگرد مظہر جانجاناں۔ وطن سرہند مولد دہلی۔ احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پچیس ۲۵ سال کی عمر میں

تہمتِ زنا پر اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تھے۔

ثنا

کون کر سکتا ہے اس خلاقِ اکبر کی ثنا
نارسا ہے شان میں جس کی پیمبر کی ثنا

سربسر اس منھ سے ہو سکتی ہے کب نعتِ رسول
یا ابوبکر و عمر عثمان و حیدر کی ثنا

یہ زباں قابل ہے کب اس بات کی جو کیجیے
حضرتِ زہرا اور شبیر و شبر کی ثنا

نام احمد کا مجھے انصاف سے لینا نہیں
کی ہے ساری عمر ترکانِ ستمگر کی ثنا

چوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں
حضرتِ استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

خوش نہیں آتا ہے بن مجنوں ہمیں صحرا ہنوز
ان غزالوں سے ہمارا جی نہیں لگتا ہنوز

اب تلک کرتا ہے تیشہ کام میں پتھر کے دخل
مانتا ہے کوہکن کے نقش کو خارا ہنوز

مُو نکالے پر بھی مستی حسن کی اتری نہیں
بھر رہا ہے مے سے یہ معشوق کی مینا ہنوز

باوجود اس کے کہ ہے زخموں کے مارے خوں میں غرق
آبِ خنجر کو ترستا ہے جگر میرا ہنوز

ہے یقیں کا عشق میں ہر مُو زبانِ احتیاج
اس پہ کم ہوتی نہیں اس کی استغنا ہنوز

رات دن خوباں کو ہے دل ہائے مفتوں کی تلاش
روز و شب لیلیٰ کو تھی در پیش مجنوں کی تلاش

اشکِ رنگیں سے گلے کو تو نے مشہد کر دیا
مر گئے ہیں دیکھ کر اس چشمِ پُرخوں کی تلاش

جس طرح سے ڈھونڈتے ہیں لوگ خاطر ہائے شاہ
اس طرح رہتی ہے مجھکو جانِ محزوں کی تلاش

جی سے میرے لگ رہی ہے سانوروں کی جستجو
جس طرح ہوتی ہے افیونی کو افیوں کی تلاش

شاعری ہے لفظ و معنی سے پرے لیکن یقیں
کون سمجھے یاں تو ہے الہام مضموں کی تلاش

کب سنے زنجیر مجھ مجروح دیوانے کی عرض
یا پہنچتی تھی کان تک اس زلف کے شانے کی عرض

گرمیِ اہلِ بزم سے مت کر کہ میں ہوتا ہوں داغ
شمع کی خدمت میں ہے اپنے ہی پروانے کی عرض

شیشہ مجھ دل سا نہ پاوے اور تری آنکھوں سا جام
گر کرے ساقی ہزاروں سال میخانے کی عرض

فصل جاتی ہے یقیںؔ اور باغباں سے ایک بار
کوئی گر دیتا نہیں ہے باغ میں جانے کی عرض

شکوہ جفائے یار کا کرنا وفا نہیں
بندوں کو اعتراض خدا پر روا نہیں
کعبہ بھی ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے
بیگانگی سے اس کی کوئی آشنا نہیں

سر پہ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا
یقیںؔ پرہیز اگر کرتا نہ یہ بیمار بہتر تھا

اشعار متفرق

جو کچھ کہیں ہیں تجکو یقیںؔ ہے سزا تری
بندہ جو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا
شکوہ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں
یقیںؔ سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا
اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا
جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ یقیںؔ
گھر سے جب باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا
کہوں میں کیونکہ نہ صبحِ بہار تجکو کہ آج
جو تو چمن میں نہ تھا گل کے منھ پر نور نہ تھا
یقیںؔ مارا گیا جرمِ محبت پر زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں
کوئی دن اور کرتے دو جنوں مجکو بہاراں میں
عبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں
کیا دل ہے اگر جلوہ گہہ یار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہوئے
حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے
جس کو منظور ہو مرنا اسے جینا ہے عذاب
ہے دمِ پاکِ مسیحا دمِ شمشیر مجھے
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہونچے
پریشاں خاک سے اگتا ہے سنبل اس سے ظاہر ہے
کھلے ہیں موئے لیلیٰ اب تلک ماتم میں مجنوں کے
دعا مستوں کی کہتی ہے یقیںؔ تاثیر رکھتی ہے
الٰہی سبز جتنا ہے جہاں میں تاک ہو جائے
اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیںؔ
ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

یکرنگ

نام غلام مصطفےٰ خاں تخلص یکرنگ۔ شاگرد مرزا جانجاناں مظہرؔ و خان آرزوؔ آپ امرائے محمد شاہی سے منسلک تھے۔ آپ کے سن پیدائش اور وفات کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ کلام بھی کمیاب ہے۔ چند اشعار حاصل ہوئے ہیں جو پیش ہیں۔

نہ کہو کہ یار جاتا ہے — دِل سے صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہو تو لے صیاد — ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

اشعار متفرق

مجھ کو معلوم ہوا یہ گل سے — پھول جاتے ہیں زر سے دولت مند
کیا جانیے وصال تیرا ہو کسے نصیب — ہم تو فراق میں اے یار مر چلے
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط — رکھتا ہوں دو نین جو کہو نذر کرو
زباں پہ شکوہ ہے مہندی کا ہر بات — کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے ہات
اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال — یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں
جو کوئی توڑتا ہے غنچہ و گل — دلِ بلبل شکستہ کرتا ہے
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت و لے — مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں
پارسائی اور جوانی کیونکہ ہوں — ایک جاگہ آگ پانی کیونکہ ہو
لگے ہیں خوب کانوں میں بتوں کے — سخن یکرنگ کے گویا گہر ہیں
جُدائی سے تری اے صندلی رنگ — مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
کیوں ہوئے ہو تم کہو دشمن ہمارے اس قدر — دوست کا ہوتا ہے دشمن کوئی پیارے اس قدر

ختم شُد

مئی ۱۹۹۲ء ۶